فریضۂ اقامت دین

مولانا صدر الدین اصلاحی

اسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
۱۳-ای شاہ عالم مارکیٹ لاہور (پاکستان)

(جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں)

نام کتاب	فریضہ اقامت دین	
مصنف	مولانا صدر الدین اصلاحی	
اشاعت	ایڈیشن	تعداد
۲تا۲۲	فروری ۲۰۰۰ء	۲۶,۴۰۰
۲۳	جولائی ۲۰۰۶ء	۲,۱۰۰

اہتمام: پروفیسر محمد امین جاوید (منیجنگ ڈائریکٹر)

ناشر: اسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
۱۳۔ای شاہ عالم مارکیٹ لاہور (پاکستان)
فون 7664504-7669546 فیکس 7658674

ای میل: www.islamic pak. com

مطبع: شریف پرنٹرز لاہور

شوروم: 10 چیمبر جی روڈ۔اردو بازار لاہور: 7248676
منصورہ ملتان روڈ۔لاہور فون: 448022
شہزاد پلازہ۔کالج روڈ۔بالمقابل اُردو بازار۔راولپنڈی

قیمت : 50 روپے

فہرست مضامین

	عرض ناشر	7
	مقدمہ	9
پہلا باب	امت مسلمہ اور اس کا مقصد وجود	11
	امت کی امتیازی حیثیت	11
	مقصد وجود (اقامت دین)	12
	اقامت دین کا مفہوم	15
دوسرا باب	مقصد فراموشی اور اس کے نتائج	19
	اصول و مقصد کی اہمیت	19
	اصول اسلام کی شرکت بے زاری	21
	مقصد شناسی کا معیاری نمونہ	25
	مقصد شناسی کا زوال	27
	امت "قسمت بلا رحمت" کے قانون کی زد میں	29
تیسرا باب	چہ باید کرد؟	43
	فرض کی پکار	43
	ملی نجات کی شاہراہ	45
	پچھلی بحثوں کا خلاصہ	48
چوتھا باب	گریز کی راہیں	50
	خواہش فرار کا دباؤ	50
	گریز کے "فلسفے"	53

1- دین کے جزوی اتباع پر اطمینان 56
پورے مجموعہ شریعت کی پیروی کا وجوب 56
سیاسی اقتدار سے محرومی کا عذر 57
اضطرار کا عذر 62
نگاہ مسلم کی بے بصیرتی 71
2- ناسازگار حالات کا عذر 77
چند تنقیحی سوالات 77
امکان کی بحث سے ادائے فرض کی بے نیازی 78
ناسازگاری احول کا واقعی تقاضا 83
غیرت کا سبق 86
جذباتیت کا بے بنیاد طعنہ 90
غلط روی کے اسباب 93
مومن کی اصل ذمے داری 94
واقعی ناکامی کا عدم امکان 96
کامیابی کا اسلامی تصور 97
عملاً قیام دین کے روشن امکانات 99
قومی مفاد کا بت 112
صحیح مفادات کے تحفظ کی قطعی ضمانت 115
پھیر کا راستہ 118
3- کلی اور ابدی مایوسی 124
حیرت انگیز حیا کشی 124
تاریخ خلافت کا "استدلال" 125
اسلامی نظام کے متعلق ایک شدید غلط فہمی 129

	اسلامی نظام سب سے زیادہ عملی نظام	131
	4۔ تربص کا رویہ	134
	نفاق زدہ ذہنیت	136
	ایک قدم اور آگے	137
	5۔ مہدی موعود کا انتظار	141
	استدلال یا فریب استدلال	141
	احتساب نفس کی ضرورت	146
پانچواں باب	اقامت دین کا طریق کار	150
	مقصد سے اصول کار کا فطری ربط	150
	طریق کار کے ماخذ	152
	اقامت دین کے قرآنی اصول	153
	(1) تقویٰ کا التزام	155
	(2) منظم اجتماعیت	157
	(3) امربالمعروف و نہی عن المنکر	161
	نبوی طریق کار کی شہادت	165
	ایک غلط فہمی کا ازالہ	168

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض ناشر

مولانا صدر الدین اصلاحی صاحب علمی دنیا میں اب کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ آپ کی متعدد بلند پایہ تصانیف مثلاً "اساس دین کی تعمیر۔ اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ' حقیقت نفاق' وغیرہ علوم دین میں گہری بصیرت و تدبر کی آئینہ دار ہیں اور علمی و دینی حلقوں سے زبردست خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔

اب ہم آپ کی ایک اور بلند پایہ تصنیف "فریضہ اقامت دین" کا جدید ایڈیشن پیش کر رہے ہیں۔ اس کتاب کو پیش کر کے مصنف نے ایک بہت بڑی دینی خدمت انجام دی ہے اور وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے۔

اس تازہ ایڈیشن میں مصنف موصوف نے سابقہ ایڈیشن پر پورے طور پر نظر ثانی کرنے کے بعد اس کو کافی اضافوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اب یہ تازہ ایڈیشن پچھلے ایڈیشن کے مقابلہ میں تقریباً" دوگنی ضخامت کا حامل ہے۔

ایک عرصہ سے امت مسلمہ اپنے مقصد وجود کو بھولتی چلی جا رہی ہے اور اب اسے یہ بھی یاد نہیں رہا ہے کہ اس کی زندگی کا حقیقی نصب العین کیا ہے اور اسے کس لئے برپا کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں امت کو وہی بھولا ہوا سبق یاد دلایا گیا ہے اور اس کو خواب غفلت سے چونکانے کے لئے پوری قوت سے جھنجوڑا گیا ہے۔ کتاب و سنت کے ناقابل تردید دلائل و شواہد سے بتایا گیا ہے کہ امت مسلمہ کا واحد نصب العین اقامت دین ہے اور اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے اسے اپنی تمام قوتیں اور صلاحیتیں' ذرائع اور وسائل بروئے کار لانے چاہئیں۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ کتاب

اقامت دین کی جدوجہد کے لیے دل کو مطمئن کرنے والے دلائل' ایک نیا ولولہ اور جوش مہیا کرے گی اور خدمت دین کے جذبہ کے لیے مہمیز ثابت ہوگی۔

ہمیں امید ہے کہ ہمارے قارئین اس کتاب کو اسی گرم جوشی کے ساتھ قبول کریں گے جو ہماری دیگر مطبوعات کے ساتھ ظاہر کی ہے اور اس طرح معیاری اسلامی کتب کو پیش کرنے میں ہمارا ہاتھ بٹائیں گے۔

منیجنگ ڈائریکٹر

اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ (پرائیویٹ) لمیٹڈ

لاہور

مقدمہ

انسانی زندگی کا بنیادی شرف یہ ہے کہ وہ ایک بامقصد زندگی ہو۔ بے مقصد زندگی بسر کرنے والا انسان دراصل بے انسانیت کا انسان ہے۔ "مسلمان" اس انسان کا نام ہے جو صرف بامقصد ہی نہیں بلکہ صحیح مقصدوالی زندگی گزارتا ہے۔ اس لیے ایک شخص اگر مسلمان ہے تو یہ اس کا سب سے بڑا اور سب سے مقدم فریضہ ہے کہ وہ اپنے مقصد حیات سے بخوبی واقف ہو' اسے ہمیشہ اپنی نظروں میں رکھے۔ اور اپنی پوری عملی زندگی اسی مرکز کے گرد گھماتا رہے۔

اس کتاب کی غرض و غایت اسی اہم ترین مسئلے کی طرف وابستگان اسلام کو پوری شدت سے متوجہ کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ غرض پوری ہو اور جو باتیں اس کتاب میں حق کے مطابق ہوں وہ دلوں میں جگہ پائیں۔ اور اگر کچھ باتیں ایسی نہ ہوں تو ان کے اثر سے ہر مسلمان محفوظ رہے۔

یہ کتاب اس سے پہلے دوبار شائع ہو چکی ہے۔ مگر دونوں بار ایسے حالات میں شائع ہوئی کہ راقم الحروف کو مسودے پر نظر ثانی کرنے اور ترتیب و تدوین کا موقع نہ مل سکا' اس لیے جب بھی وہ شائع ہوئی ناقص انداز ہی میں شائع ہوئی۔ اب کی بار اللہ تعالیٰ نے اس بات کا موقع عنایت فرمایا تو پچھلی اشاعتوں کے مقابلے میں بحمدللہ' اس بار کافی مختلف حالت میں شائع ہو رہی ہے۔ زبان بھی قدرے آسان کردی گئی ہے۔ بعض ضروری مباحث بھی بڑھا دیے گئے ہیں۔ اور بعض غیر ضروری چیزیں حذف بھی کر دی

گئی ہیں ۔ نیز مباحث کی ترتیب بھی بہتر بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ امید ہے کہ اس طرح اس کی افادیت ضرور بڑھ گئی ہوگی۔

صدرالدین

۱۸ رجب ۷۷ ۱۳ھ

پہلا باب

امت مسلمہ اور اس کا مقصد وجود

امت کی امتیازی حیثیت

امت مسلمہ جس وقت وجود میں لائی جارہی تھی۔ اس کے لانے والے نے اس کے بارے میں فرمایا۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (آل عمران۔ ۱۱۰)

"تم ایک بہترین امت ہو جو سب انسانوں کے لیے وجود میں لائی گئی ہے"

یہ کلمات دو اجزا پر مشتمل ہیں:۔

(۱) مسلمانوں کی جماعت تمام انسانی جماعتوں میں سب سے اچھی جماعت ہو گی۔ دوسری کوئی جماعت کوئی قوم' کوئی پارٹی فکر اور عمل کی خوبیوں میں اس جیسی نہ ہو گی (كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ)

(۲) یہ جماعت' یہ امت مسلمہ' دنیا کی عام جماعتوں' قوموں اور گروہوں کی طرح زندگی کے اسٹیج پر معمول کے مطابق یوں ہی نہیں آنکلی ہے بلکہ ایک خاص اہتمام سے نکال کر لائی گئی ہے۔ اس کے لائے جانے کے پیچھے ایک خاص مقصد کام کررہا ہے۔ دنیا کے دوسرے تمام گروہوں کے اور اس کے درمیان ایک بنیادی فرق ہے' اور وہ یہ کہ یہ انہی میں سے ایک نہیں ہے۔ بلکہ ان سب سے الگ اور ممتاز ہے۔ اور ان کی کسی خاص ضرورت کے لئے اسے وجود بخشا گیا اور اہتمام کے ساتھ بھیجا گیا اور اب وہ ہمیشہ کے لئے اسی کی بجا آوری پر مامور ہے۔ (أُخْرِجَتْ

لِلنَّاسِ) چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں بھی اس امت کو صریح لفظوں میں "مبعوث" یعنی بھیجی اور مامور کی ہوئی امت قرار دیا گیا ہے مثلاً"

فَإِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِينَ وَلَمْ تُبْعَثُوا مُعَسِّرِينَ (بخاری جلد دوم)

"تم نرمی سے کام لینے والے بنا کر بھیجے گئے ہو سختیاں میں ڈالنے والے بنا کر نہیں بھیجے گئے ہو۔"

اللہ اور رسولؐ کے ان ارشادات سے صاف واضح ہوتا ہے کہ دوسری تمام امتیں اور قومیں ایک سطح پر ہیں اور امت مسلمہ ایک دوسری سطح پر ہے۔ وہ ایک جداگانہ نوعیت کی مالک اور ایک امتیازی حیثیت کی حامل ہے۔ جب اس کی نوعیت اور حیثیت دوسری تمام قوموں سے مختلف اور ممتاز ہے تو اس سے آپ سے آپ یہ بات لازم ہے کہ وہ اپنے طرز فکر میں' اپنے طریق عمل میں' اپنی دلچسپیوں میں' اپنی قدروں میں' اپنی پسند و ناپسند کے معیاروں میں' اپنے مزاج میں اور اپنے مقصد و نصب العین میں' غرض ایک ایک پہلو سے وہ اپنا الگ اور مخصوص مقام رکھتی ہے اور اس کے کسی معاملے کو دوسری کسی قوم یا جماعت پر ہرگز نہیں قیاس کیا جا سکتا۔

مقصد وجود (اقامت دین)

اس وضاحت سے اتنی بات تو متعین طور سے معلوم ہو جاتی ہے کہ اس امت کے وجود کا کوئی خاص اور ممتاز مقصد ہے۔ اب دریافت طلب بات یہ رہ جاتی ہے کہ اس کے وجود کا یہ خاص اور ممتاز مقصد کیا ہے؟ قرآن مجید نے مذکورہ بالا الفاظ فرمانے کے معاً بعد ہی اس سوال کا بھی جواب دے دیا ہے۔ وہ فرماتا ہے :-

تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ

"تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو"

یعنی وہ خاص کام جس کے لئے مسلمانوں کا یہ گروہ برپا کیا گیا ہے' یہ ہے کہ وہ پوری نوع انسانی کو غلط فکریوں اور غلط کاریوں سے روک کر صحیح راہ پر لائے۔

اس خاص کام یا خاص مقصد کے بیان کے لئے اللہ تعالیٰ نے دو اور تعبیریں اختیار فرمائی ہیں۔ ان میں سے پہلی تعبیر "شہادت حق" کی ہے۔ چنانچہ اس کا ارشاد ہے :۔

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ (بقرہ ۔ ۱۴۳)

"اور اسی طرح ہم نے (اے مسلمانو!) تمہیں ایک معتدل امت بنایا ہے تاکہ تم (دوسرے تمام) انسانوں کے لئے گواہ ہو"۔

اس مفہوم کی اور انہی جیسے لفظوں میں ایک آیت سورہ حج میں بھی موجود ہے' اور اگرچہ ان میں سے کسی آیت کے اندر بھی اس چیز کی صراحت نہیں کی گئی ہے جس کی گواہی (شہادت) دینے کے لئے یہ امت مبعوث کی گئی ہے۔ مگر اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ بجائے خود بالکل صریح تھی۔ ظاہر ہے کہ جو شے اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی جا رہی تھی اس کے سوا اور کون سی چیز ہو سکتی ہے جس کی اہل دنیا کے سامنے شہادت دینے کا اسے ذمہ دار بنایا جاتا ہے؟ اس کا ثبوت خود انہی آیتوں کے ان لفظوں میں بھی موجود ہے جو مذکورہ لفظوں کے بعد لائے گئے ہیں اور جن میں فرمایا ہے کہ " اور پیغمبر تمہارے لئے گواہ ہو"۔ (وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ") غور کر لیجئے وہ کیا چیز تھی جس کی اہل ایمان کے سامنے گواہی دینے کے لئے اللہ کا رسولؐ بھیجا گیا تھا؟ اگر یہ چیز صرف وہ دین حق تھی جو اس پر نازل ہو رہا تھا اور اس میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں' جیسا کہ واقع ہے' تو اس میں بھی دو رائیں ممکن نہیں کہ جس چیز کی گواہی دینے کے لیے "امت وسط" کو قائم کیا گیا تھا وہ بھی یہی دین حق تھا جسے چاہے آپ "دین حق" کہہ لیجئے' چاہے صرف حق۔

دوسری تعبیر "اقامت دین" کی ہے :۔

شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ (شوریٰ ۔ ۱۳)

"(مسلمانو) اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے وہی دین مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوحؑ کو دیا تھا اور جس کی (اے نبیؐ) ہم نے تم پر وحی کی ہے اور جس کا حکم ہم نے ابراہیمؑ کو موسیٰؑ کو اور عیسیٰؑ کو دیا تھا کہ اس دین کو قائم کرو"۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ' صحابہ کرام کا مقام و مرتبہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

اِخْتَارَهُمُ اللّٰهُ لِصُحْبَةِ نَبِيِّهٖ وَلِاِقَامَةِ دِيْنِهٖ (مشکوٰۃ)

"انہیں اللہ نے اپنے نبیؐ کی معیت اور اپنے دین کی اقامت کے لئے پسند فرمایا تھا"۔

یہ بات بھی اس امر کو ایک امر واقعہ بتاتی ہے کہ اس امت کی غایت وجود اللہ کے دین کی اقامت تھی۔

قرآن اور حدیث کے ان تینوں بیانات کی بنا پر امت مسلمہ کے مقصد وجود کے لئے آپ جس تعبیر کو چاہیں اختیار کرسکتے ہیں۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس امت کا مقصد وجود امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ "شہادت حق" ہے' اور یہ بھی کہ "اقامت دین" ہے۔ کیونکہ یہ تینوں ایک ہی مدعا کی مختلف تعبیریں ہیں اور ان میں سے جس کو بھی آپ استعمال کریں گے معنی و مقصود ہر حال میں ایک ہی ہوگا۔

لیکن معنی و مقصود کی اس یکسانی کے باوجود' اگر آپ ان تینوں تعبیرات کا گہری نظر سے جائزہ لے کر ان کا ہر پہلو سے موازنہ کریں گے تو یہ پائیں گے کہ آخری تعبیر میں جو جامعیت' جو ہمہ گیری اور جو صراحت ہے وہ دوسری تعبیروں میں نہیں ہے۔

زیادہ جامعیت اس طرح ہے اس میں "اقامت" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اقامت کا لفظ جیسا کہ آگے چل کر وضاحت سے معلوم ہوگا ایک مکمل کیفیت کا تصور پیش کرتا ہے۔

زیادہ ہمہ گیری یوں ہے کہ متعلقہ آیت میں صرف اتنا ہی نہیں فرمایا گیا ہے کہ

فلاں شے مسلمانوں کا فریضہ حیات ہے بلکہ یہ بھی واضح کردیا گیا ہے کہ یہی فریضہ ہر نبی کا اور اس کے ساتھیوں کا رہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں گویا بات یہ فرمائی گئی ہے کہ اللہ پر ایمان لانے اور اس کی بندگی کا عہد کرنے کے معنی ہی یہ ہیں کہ اس کے دین کی اقامت کی جائے۔

زیادہ صراحت اس طرح ہے کہ اس چیز کا ذکر جس کی اقامت اہل ایمان کو کرنی ہے متعلقہ آیت میں بالتصریح موجود ہے اور نام لے کر فرمادیا گیا ہے کہ یہ چیز "الدین" یعنی اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا دین ہے۔

ان خصوصیتوں کی بنا پر "اقامت دین" کی تعبیر کو غالب اصطلاح ہونے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے امت مسلمہ کا مقصد وجود ظاہر کرنے کے لیے اسی کا استعمال زیادہ مناسب رہے گا۔

اقامت دین کا مفہوم

"اقامت دین" کی اصطلاح دو لفظوں سے مرکب ہے۔ ایک "اقامت" دوسرا "دین"۔ اس لئے اس کا مفہوم سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ان دونوں لفظوں کے الگ الگ معنی سمجھ لئے جائیں۔

اقامت کا لفظ جب کسی ٹھوس چیز کے لیے بولا جائے تو اس وقت اس کے معنی سیدھا کر دینے کے ہوتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے۔

يُرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ (کہف - ۷۷)

دیوار (ایک طرف کو جھک گئی تھی اور) گرا چاہتی تھی تو اس نے اسے سیدھا کردیا۔

اور جب وہ کسی ٹھوس چیز کے بجائے معنوی اشیاء کے لیے بولا جاتا ہے تو اس وقت اس کا مفہوم پورا پورا حق ادا کر دینے کا ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ متعلقہ کام کو پوری توجہ اور کامل اہتمام کے ساتھ بہترین شکل میں انجام دے دیا جائے۔ امام اللغۃ علامہ

راغب اصفہانی فرماتے ہیں۔

اقامته الشی توفیته حقه وقال قل یا اهل الکتاب لستم علی شی حتی تقیموا التوراة والانجیل ای توفون حقوقها بالعلم والعمل (المفردات)

"کسی چیز کو قائم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے حقوق اچھی طرح پورے کر دیئے جائیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے پیغمبر کہہ دو اے اہل کتاب تم کسی اصل پر نہیں ہو جب تک کہ تورات اور انجیل کو قائم نہ کر لو۔ یعنی جب تک کہ علمی اور عملی دونوں حیثیتوں سے ان کے حقوق ادا نہ کر دو"۔

اس مفہوم کو ایک مثال سے سمجھئے قرآن میں نماز کی اقامت کا حکم دیا گیا ہے۔ "اقامت" کے اس مفہوم کی رو سے نماز کی اقامت یہ ہوگی کہ اسے اس کے تمام ظاہری آداب و شرائط اور سارے باطنی محاسن کے ساتھ ادا کیا جاتا رہے۔ اس طرح کہ نماز کا جو مقصد ہے وہ بحسن و خوبی حاصل ہوتا رہے لہٰذا دین کی اقامت یہ ہوئی کہ اس کے ماننے والے علمی اور عملی دونوں حیثیوں سے اس کے ماننے کا حق ادا کریں۔

دین کے لغوی معنی اطاعت کے ہیں۔ اور اصطلاحاً" اس سے مراد اللہ کی بندگی کا وہ طریقہ اور انسانی زندگی کا وہ نظام ہے جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے پیغمبر علیہ السلام کے ذریعہ اس کے بندوں کو عمل درآمد کے لیے دیا گیا ہے۔ اور جس کی تفصیلات اس کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت میں موجود ہیں۔ ان تفصیلات کے دیکھنے سے اس بات میں کسی شک کی گنجائش مطلق نہیں رہ جاتی کہ انسانیت کا کوئی مسئلہ اور انسانی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جو اس کے دائرے میں نہ آگیا ہو۔ یہ دین انسان کی عقل و فہم اور اس کے دل کی گہرائیوں سے شروع ہو کر اس کی عبادت گاہوں، اس کے گھر کی چاردیواریوں، اس کے خاندانی حلقوں، اس کے تمدنی اداروں سے ہوتا ہوا اس کے تمام اجتماعی اور بین الاقوامی مسئلوں کے آخری کنارے تک پہنچتا ہے اور ہر مسئلے ہر معاملے

اور ہر شعبے کے متعلق اپنی مستقل ہدایات دیتا ہے۔ وہ انسان کی کسی ایسی نجی اور پرائیویٹ زندگی کا بالکل قائل نہیں' جس میں وہ اپنی سی کرنے میں آزاد ہو' وہ انسانی زندگی کے لیے کسی ایسی دنیا کا وجود تسلیم کرنے کے لیے قطعاً تیار نہیں جہاں وہ خود موجود نہ ہو۔ وہ ایمانیات کو' عقائد کو' عبادات کو' اخلاق کو تقویٰ اور احسان کو تو اپنے اجزاء کہتا ہی ہے۔ بیت الخلاء کے آداب اور ازدواجی تعلقات جیسی چیزوں کو بھی اپنے سے بے تعلق نہیں قرار دیتا' اور مجرموں پر سزا کے نفاذ کو بھی اللہ کا دین ہی کہتا ہے۔
وَلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ (نور - ۲)

اقامت اور "دین" کے ان مفہوموں کو سامنے رکھئے۔ "اقامت دین" کا مفہوم خود بخود معلوم ہو جائے گا۔ جب اقامت کے معنی علمی اور عملی دونوں حیثیتوں سے پورا پورا حق ادا کرنے کے ہیں اور دین کا مفہوم اللہ تعالیٰ کی ایسی کامل اطاعت ہے جس سے زندگی کا ایک گوشہ بھی بے تعلق نہیں اور جس کے مطالبے وہاں ختم ہوتے ہیں جہاں انسانیت کے مسائل کی آخری حد آجاتی ہے تو اقامت دین کا مفہوم لازماً" یہی ہوگا اور صرف یہی ہو سکتا ہے کہ اس دین پر ایمان رکھنے والے اس سے پوری طرح واقف ہوں' اس کے بنیادی تصورات سے' اس کے اصول سے' اس کے احکام و ہدایات سے باخبر ہوں۔ اس کے مقصد و منشا کو جانتے ہوں۔ انھیں یہ معلوم ہو کہ وہ اس دنیا میں ان کی کیا پوزیشن ٹھہراتا ہے؟ ان کے وجود کی کیا غایت مقرر کرتا ہے؟ اس غایت تک پہنچنے کے لیے سعی و عمل کی راہیں کیا تجویز کرتا ہے؟ انہیں کن کن باتوں کے کرنے کا حکم دیتا ہے اور کن کن باتوں سے روکتا ہے؟ زندگی کے مختلف شعبوں میں انہیں کیا رویہ اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے؟ غرض بحیثیت فرد اور بحیثیت جماعت وہ ان سے زمین پر کس طرح رہنے' کیا کرنے اور کیا بننے کا مطالبہ کرتا ہے؟ وہ یہ سب کچھ جانتے ہوں اور پھر اس جاننے کے مطابق اپنے عمل کو ڈھال لینے میں لگ جائیں۔ قرآن اور سنت کی ایک ایک ہدایت پر عمل ہو۔ شریعت کا ایک ایک حکم نافذ ہو۔ دین کے جتنے اصول ہوں ان سب پر' اور صرف ان ہی پر حیات ملی کی عمارت بنائی

جائے۔ کوئی بھی معاملہ ہو نقطہ نظر صرف وہ اختیار کیا جائے جو یہ دین سکھاتا ہے اور پوری سوسائٹی پر رنگ وہ چھا جائے جو پیدا کرنا چاہتا ہے۔ یہاں تک کہ دیکھنے والوں کو پورا ماحول قرآنی اور پورا معاشرہ ایک متحرک قرآن نظر آنے لگے۔ یعنی جس طرح کوئی بلند قامت شے سیدھی کھڑی کردی جاتی ہے تو دیکھنے والے بیک نگاہ دیکھ لیتے ہیں کہ وہ کیا ہے اور کیسی ہے؟ اسی طرح یہ پورا دین انسانی زندگی پر اس طرح غالب اور نافذ ہوجائے کہ وہ دور سے "دیکھ" اور "پہچان" لیا جائے۔

دوسرا باب

مقصد فراموشی اور اس کے نتائج

اصول و مقاصد کی اہمیت

کسی خاص اور اہم مقصد کی علمبردار جماعت کی زندگی اس بات پر موقوف ہے کہ اس کی نگاہ اپنے مقصد اور نصب العین پر اچھی طرح جمی رہے اور مقصد و نصب العین پر نگاہ کا جما رہنا اس بات پر موقوف ہے کہ اس مقصد تک پہنچنے کے جو اصول ہیں انہیں یہ جماعت دل و جان سے عزیز رکھتی ہو۔ اگر اس کے افراد میں اپنے مقصد کا گہرا عشق' اور اپنے اصول کا گہرا یقین موجود ہو تو موت اس کو آنکھیں نہیں دکھا سکتی۔ یہ عشق و یقین اس بات کی ضمانت ہے کہ اس جماعت سے عزت و اقبال منہ نہیں موڑ سکتے۔ اور پھر اسی عشق و یقین کا یہ لازمی و فطری تقاضا ہے کہ جماعت کا اجتماعی نظم و نسق اس کے اپنے ہاتھوں میں ہو۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی اس صورت حال کو برداشت نہیں کر سکتی کہ کوئی ایسا اجتماعی نظم اس پر مسلط ہو جو اس کے محبوب اصولوں پر تعمیر نہ کیا گیا ہو اور اگر سوء اتفاق سے اس پر کبھی ایسے دن آہی پڑے تو اس کا ایک ایک فرد اس مچھلی کی طرح بے قرار ہو رہے گا جس کو پانی سے نکال کر خشکی پر ڈال دیا گیا ہو۔ اور اپنے مقصد' اپنے اصول اور اپنے نظام حیات کی محبت اسے موت کی بازی کھیلنے پر مجبور کردے گی۔ وہ رائج الوقت نظام کے خلاف سراپا اضطراب بن جائے گی۔ اور اس کے ساتھ کسی قسم کے اختیاری تعاون یا مداہنت کا تصور تک اس کے لیے ناقابل برداشت

ہوگا کیونکہ وہ جانتا ہوگا کہ جس انفرادی اور جماعتی زندگی کا تشخص جن اصولوں سے قائم ہے ان کا اسی نظام قاہر نے گلا گھونٹ رکھا ہے۔ یہ اضطراب سکون سے اسی وقت بدل سکے گا جب کہ وہ اس نظام غیر کی دھجیاں بکھیر چکا ہوگا۔

اس کے بخلاف اگر کسی جماعت کے اندر اپنے اصولوں کا یقین مرجھا گیا اور اپنے مقصد و نصب العین کا عشق بے جان ہوگیا ہو تو یہ اس کے مٹ جانے کی ناقابل انکار علامت ہے۔ اس کم یقینی اور سرد مہری کے نتیجے میں اگر اس کے اندر کسی دوسرے نظام کے ساتھ تعاون اور مداہنت کا رجحان ابھر آئے تو اس پر ہرگز کوئی تعجب نہ کرنا چاہیے اور کسی ایسے رجحان کا ابھر آنا اس کے سوا اور کوئی معنی نہیں رکھتا کہ حیات ملی کے محافظوں نے خزانہ کی کنجیاں دشمنوں کے حوالہ کردیں۔ اور اب اس پونجی کا لٹ جانا بس کوئی دن کی بات ہے جسے کوئی معجزہ ہی روک سکا ہو تو روک سکے۔ پھر چونکہ زوال ہو یا کمال اس دنیا میں کسی کی فطرت میں ٹھہراؤ نہیں ہے۔ اس لیے اس کے یقین و عشق میں اس زوال کا عمل اپنی رفتار سے برابر آگے بڑھتا جاتا ہے۔ اور آخر کار ایک مقام پر پہنچ کر وہ اس لٹی ہوئی پونجی کے لٹ جانے کے احساس کو بھی لوٹ لیتا ہے۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب افراد جماعت میں کسی دوسرے اصول و نظام زندگی کی غلامی کا ذوق پیدا ہوجاتا ہے۔ جب وہ تعاون اور مداہنت کی بھی حدیں پھاند چکے ہوتے ہیں۔ جب انہیں اپنا اصولی اور اخلاقی موقف ہی نہیں یاد رہ جاتا۔ جب وہ اپنے مقصد اور اصول سے اتنے بیگانہ ہوجاتے ہیں کہ ان کا عملی رویہ تو ان چیزوں کے غلط اور ناقابل قبول ہونے کی گواہی دینے ہی لگتا ہے ان کو نظری طور پر بھی یہ گوارا نہیں رہ جاتا کہ معاشرے اور مملکت کی باگ ڈور پھر سے ان اصولوں کے ہاتھ میں دے دیئے جانے کی کوئی جدوجہد کی جائے اور اگر کسی گوشے سے اس طرح کی کوئی پکار بلند ہو جاتی ہے تو وہ اسے حیرت کے کانوں سے سنتے اور اختلاف و عناد کی زبانوں سے اس کا جواب دیتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر جماعت بحیثیت ایک اصولی جماعت ہونے کے فنا ہوجاتی ہے اور اس کے نالائق فرزند اپنے ہی ہاتھوں اسے قبر کی گہرائیوں

میں سلا دیتے ہیں۔

ان دونوں موخرالذکر صورتوں میں یہ ضروری نہیں ہے کہ جماعت مادّی حیثیت سے بھی بے نام و نمود ہو جائے اور دنیا کی دولت اور سیاست میں اس کے لیے کوئی جگہ باقی نہ رہ جائے۔ اس کے برعکس یہ عین ممکن ہے کہ عام مادّی تدبیروں پر عمل کر کے وہ اقوام عالم کی صفوں میں ایک نمایاں اور عظیم الشان پوزیشن کی مالک ہو جائے۔ اس کے پاس حکومت کا کروفر ہو' دولت کی شان و شوکت ہو' قوی اقتدار اور بین الاقوامی وقار ہو۔ لیکن اپنی ان تمام شوکتوں اور عظمتوں کے باوجود اس مقصد اور ان اصولوں کے نقطۂ نظر سے' جن پر اس جماعت کی بنیاد قائم تھی اس کا وجود وعدم برابر ہے۔ جن اصولوں کی لاش ان کے پیروں تلے روندی جارہی ہو ان کو اس سے کیا بحث کہ وہ ذلت کی خاک پر ہے یا عظمت کے آسمان پر۔ ان کو اگر بحث ہے تو صرف اس بات سے کہ زندگی کے میدان میں ہمیں غالب و کار فرما بنانے کی اس کے افراد کے دلوں میں کتنی لگن ہے؟ اور وہ اس کے لیے اپنی جان' اپنے مال' اپنے ذرائع اور اپنی قوتوں کی کتنی قربانیاں دے رہے ہیں؟ لیکن اگر یہ کچھ نہیں ہے تو اپنی زبان حال سے یہ اصول ان سے اپنی بے تعلقی کا اعلان کردیں گے۔ اور پھر انصاف و دیانت کا کھلا تقاضا ہوگا کہ یہ لوگ بھی اپنی طرف سے اس اعلان کے برحق ہونے کی تصدیق کردیں' اب ان کے لیے یہ کسی طرح بھی جائز نہیں رہ جاتا کہ وہ ان اصولوں کا نام بدستور اب بھی لیتے جائیں اور اپنے آپ کو اس جماعتی لقب سے موسوم کرتے رہیں جو کبھی ان اصولوں کی صحیح نمائندگی کے سبب ہی انہیں ملا تھا۔ کیونکہ اب وہ ان کے نمائندے باقی نہ رہے۔

اصول اسلام کی شرکت بیزاری

اس اصولی حقیقت کا اطلاق دنیا کی ہر جماعت پر ہوتا ہے امت مسلمہ بھی اس کلیہ سے کسی طرح مستثنیٰ نہیں ہوسکتی۔ اس کی بھی اپنی واقعی زندگی کا دارومدار' اول و

آخر' اپنے اصل مقصد وجود اور اپنے اصول حیات ہی پر ہے۔ اس کے لیے بھی اپنے اصولوں کی اہمیت ویسی ہی ہے جیسی کہ کسی اور جماعت کے لیے اس کے اصولوں کی ہوسکتی ہے بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ۔ کیونکہ زندگی کے دوسرے مسلکوں کے مقابلہ میں اسلامی مسلک حیات کی ایک ممتاز نوعیت ہے وہ ایک ایسی خصوصیت کا حامل ہے جو کسی اور مسلک (ازم) اور نظام میں نہیں پائی جاتی ۔ دنیا میں اسلام کے علاوہ دوسرے جتنے بھی نظام پیش کئے گئے ہیں وہ سب انسان کے اپنے دماغ کی پیداوار ہیں۔ اس لیے مزید غور و فکر اور نئے تجربات اور معلومات کی روشنی میں ان کے اندر ترمیم کی گنجائش ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ حتیٰ کہ ضرورت جب مجبور کردیتی ہے تو ان میں کتنے ہی بیرونی اصولوں کا پیوند بھی لگا لیا جاتا ہے جس پر ان کے مخلص سے مخلص اور پرجوش سے پرجوش عقیدت مندوں کو بھی عموماً" کسی احتجاج کا خیال تک نہیں آتا۔ لیکن اسلام کا معاملہ اس باب میں بالکل دوسرا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ میرا پیش کیا ہوا مسلک حیات اور میرے اصول کسی انسانی دماغ کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ یہ اس علیم و خبیر کے تجویز فرمائے ہوئے ہیں جو نوع انسانی کے فطری تقاضوں' اس کی انفرادی اور اجتماعی مصلحتوں اور اس کی تمام داخلی اور خارجی ضرورتوں کا صحیح اندازہ واں ہے۔ اور جس کی نگاہ سے انسانی سرشت کا کوئی گوشہ بھی مخفی نہیں۔ اس لیے یہ مسلک کامل عدل اور توازن کا مسلک ہے فطرت کے ٹھوس حقائق پر مبنی ہے عالمگیر اور جہانی ہے۔ وقت اور جگہ کی حد بندیوں سے آزاد اور کسی ترمیم کی ضرورت سے ہمیشہ کے لیے بے نیاز ہے۔ بشری علوم و افکار اور نئے سے نئے تجربات اور معلومات اس کی کسی ایک اصل پر بھی کبھی انگلی نہیں رکھ سکتے۔ اس لیے اگر کسی نے اس کی پیروی کا دعویٰ رکھتے ہوئے بھی ایسی کوئی جسارت کرنی چاہی تو اس کا شمار اس کے باغیوں میں ہو گا' نہ کہ فرمانبرداروں میں۔

کہا جاسکتا ہے کہ اسلام کا یہ رویہ بہت سخت اور سرتاسر آمرانہ ہے لیکن یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو یا تو اسلام کے اس دعویٰ ہی کا منکر ہو کہ وہ ایک خداوندی

مسلک خیانت ہے۔ یا پھر وہ حقیقت اور گمان میں فرق ہی کرنا نہ جانتا ہو اور علم الٰہی کو علم انسانی پر قیاس کرتا ہو۔ ورنہ اس سے بڑا منطقی دیوالیہ پن اور کیا ہوگا کہ ایک شخص یہ بھی کہتا ہو کہ اسلام کے پیش کیے ہوئے اصولوں کا سرچشمہ علم الٰہی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہو کہ یہ اصول قابل ترمیم بھی ہوسکتے ہیں۔ اس مسلک خیانت کا کٹر سے کٹر مخالف بھی ازروئے انصاف کسی کو یہ حق آزادی نہیں دے سکتا کہ ایک طرف تو وہ اسلام کی عقیدت کا دم بھرے، دوسری طرف اس کے اصولوں پر عمل جراحی بھی کرتا پھرے۔ ہاں اس کو یہ آزادی ہر وقت حاصل ہے کہ وہ سرے سے اسلام ہی کو چھوڑ دے اگر اس کے پورے دعوے کی پوری سچائی میں اسے تردد ہو اور اس کے نزدیک اس کے اصول ترمیم واصلاح کے محتاج ہوں۔

اس فرق کو ذہن نشین کرلینے کے بعد یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ اگر کسی اور جماعت کیلئے اپنے مسلک کے مخالف اصولوں سے تعاون یا مصالحت کرنا ممکن ہو تو ہو، مگر اسلام کے نام پر بننے والی جماعت کیلئے تو کسی غیر اسلامی نظام زندگی سے مصالحت یا مداہنت کا تصور بھی حرام ہے چنانچہ جب قرآن نازل ہورہا تھا اور ملت اسلامیہ کی بنیادیں بھری جارہی تھیں تو اس کو مخالف کیمپ سے اس پالیسی کے اختیار کر لینے کی بار بار ترغیب ملتی رہی۔ مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے قطعیٔ ہدایت تھی کہ پیغمبر اور ان کے ساتھی اس ترغیب کو ہرگز خاطر میں نہ لائیں۔ مثلاً اس کیمپ نے اپنی اسلام دشمن تدبیروں اور سرگرمیوں کو کسی طرح بھی کامیاب ہوتے نہ دیکھا تو اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ۔

اِئْتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ۔ (یونس)

"اس قرآن کے بجائے کوئی دوسری کتاب لایئے' یا پھر اس میں ردو بدل کر دیجئے"۔

اس تجویز کے پیش کرنے والوں کا منشاء صاف ظاہر ہے دراصل یہ ایک تجویز یا مطالبے سے زیادہ ان کی طرف سے ایک پیشکش تھی۔ ان کا مدعا یہ تھا کہ محمد صلی اللہ

علیہ وسلم' اپنی تعلیمات میں ہمارے مشرکانہ افکار و عقائد کے لیے بھی کوئی گنجائش نکال دیں تو ہم ان کی مخالفت سے باز آجائیں گے۔ اور ان کی بات مان کر ان کے پیرو بن جائیں گے۔ ان کی اس تجویز یا پیشکش کا جو جواب اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دلایا وہ یہ تھا۔

قُلْ مَا يَكُونُ لِيٓ أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيٓ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰٓ إِلَيَّ (یونس-۱۵)

"ان سے کہہ دو کہ مجھے اس بات کا قطعا" کوئی استحقاق نہیں کہ میں اپنی طرف سے اس قرآن میں کوئی رد و بدل کردوں۔ میں تو بس اس چیز کی پیروی کرتا ہوں جس کی میری طرف وحی کی جاتی ہے"۔

اصولی اور بنیادی باتیں تو خیر بڑی چیز ہوتی ہیں اللہ تعالیٰ نے تو اپنے پیغمبر کو اس بات سے بھی پوری سختی کے ساتھ خبردار کردیا تھا کہ خواہ حالات کا تقاضا اور وقت کی مصلحت کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ وہ شریعت کے کسی ایک جزوی قانون کو بھی نظر انداز نہیں کرسکتے۔

أَنِ احْكُم بَيْنَهُم بِمَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَآءَهُمْ وَٱحْذَرْهُمْ أَن يَفْتِنُوكَ عَنۢ بَعْضِ مَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ إِلَيْكَ (مائدہ ۴۹)

"اے پیغمبر! ان کے درمیان اس قانون کے مطابق فیصلہ کرو جسے اللہ نے نازل فرمایا ہے اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو' اور دیکھو! اس بات سے ہوشیار رہو کہ کہیں یہ لوگ تم کو اس ہدایت کے کسی جز سے (غافل کرکے) فتنہ میں نہ ڈال دیں جس کو اللہ نے تم پر اتارا ہے"۔

یہ تو اسلامی تعلیمات میں کسی بنیادی یا جزئی ترمیم کو خواہش اور کوشش کا معاملہ تھا اس کے بعد دوسرے درجہ پر ان کی ایک اور خواہش اور کوشش ہوئی اور وہ یہ کہ کاش محمد صلی اللہ علیہ وسلم' تبلیغ دین کے بارے میں مداہنت سے کام لیں تو وہ بھی یہی پالیسی اختیار کرلیں۔ وَدُّوا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُونَ (قلم ۹) اور یوں یہ کش مکش

ختم ہو جائے۔

"مداہنت سے کام لینے" کا مطلب یہ تھا کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم شرک کی تردید سے باز آجائیں۔ اور اپنی دعوت توحید کو صرف اثباتی پہلو سے پیش کرنے پر اکتفا کرلیں۔ گویا ان کی پہلی تجویز یا پیشکش' اسلام اور شرک کا آمیزہ بنا لینے کی خواہش تھی۔ تو دوسری پیشکش اسلام اور شرک کے "پر امن باہمی وجود" کی خواہش تھی۔ مگر جس طرح پہلی کے منظور کرلیے جانے کو ناممکن فرمایا گیا اسی طرح اس دوسری خواہش کو بھی یک لخت ٹھکرا دیا گیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو یہی حکم دیا کہ اس طرح کی باتیں ہرگز نہ مانیں' (فَلَا تُطِعْ كُلَّ اَفَّاکٍ اَثِيْمٍ)

یہ قرآنی تصریحات اسلام کے اصولوں ہی کا نہیں بلکہ ان جمیع تعلیمات اور اس کے مخصوص مزاج' سب کا مقام بالکل واضح طور سے متعین کرتی ہیں۔ ان کے بعد کسی شخص کو یہ کہنے کہ اجازت ہرگز نہیں دی جاسکتی کہ اسلام کو اپنا لینے یا اپنائے رکھنے کے باوجود اس کے اصولوں کی پیروی میں انسان آزاد ہے اور حسب ضرورت ان میں ترمیم کرسکتا ہے۔

مقصد شناسی کا معیاری نمونہ

عملاً" آج امت مسلمہ کی جو حالت بھی ہو مگر اپنی زندگی کے آغاز میں ہر با اصول جماعت کی طرح یہ جماعت بھی اپنے مقصد کا گہرا عشق اور اپنے اصولوں کا سچا یقین لے کر اٹھی تھی۔ اور اس طرح اٹھی کہ رکاوٹوں کی کوئی بڑی سے بڑی چٹان بھی اس کا رخ نہ موڑ سکی۔ اس راہ میں اسے کیا کچھ پیش نہیں آیا؟ جانی اور مالی مصیبتوں نے اس پر یورش کی' سخت ترین خطرات نے اسے دھمکایا' رات کی نیند اس کی چھنی' دن کا سکون اس کا برہم ہوا۔ قید و بند کی آزمائشوں نے اسے آنکھیں دکھائیں۔ مگر تاریخ گواہ ہے اور اس گواہی کو کوئی بھی جھٹلا نہیں سکتا کہ ہولناک مصائب اور مشکلات کے اس امنڈتے ہوئے طوفان میں بھی یہ جماعت اپنے اصل موقف سے ایک انچ ہٹنے

پر بھی کبھی راضی نہیں ہوئی۔ حالانکہ اگر وہ مصلحت اور مداہنت کو ذرا بھی راہ دے دیتی تو یہ سارا ہنگامہ مصائب ایک دم سرد پڑ جاتا۔ دن رات کی بے اطمینانیاں امن و سکون سے بدل جاتیں۔ معاشی تنگیاں بھی دور ہو جاتیں اور پورا عرب اس کی سیاسی برتری کو بھی بڑی آسانی سے تسلیم کرلیتا۔ جیسا کہ تاریخ[1] بتاتی ہے اور قرآن کے کھلے ہوئے اشارات سے ثابت ہوتا ہے۔ لیکن اس کے لیڈر اور پیرو بھی جانتے تھے کہ یہ مداہنت، یعنی شرک اور توحید کے پر امن باہمی وجود کی دعوت، ان کے لیے موت کی دعوت ہے کیونکہ اپنے اصولوں کو چھوڑ دینے کے بعد ہمارا وجود اپنے مقصد کے لحاظ سے بالکل بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔ اس لیے یہ لوگ آگ اور خون کے طوفانوں میں بھی اپنے مرکز پر جمے رہتے۔ اور حالات کی کوئی ساز گاری یا مصلحت انہیں اپنے مسلک سے بال برابر بھی نہ ہٹا سکی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے تمام ہنگامی مسئلوں، مادی مصلحتوں، ظاہری تدبیروں اور وقت و ماحول کے تقاضوں سے آنکھیں بند کر لی ہیں۔ بس ایک "جنون" ہے جس نے انہیں "عقل و دانش" کا دشمن بنا ڈالا ہے۔ چنانچہ اس زمانے کے سیاست دانوں اور مدبروں کا متفقہ فیصلہ ان کے بارے میں یہی تھا کہ "انہیں ان کے دین نے فریب میں مبتلا کررکھا ہے"۔ (غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ دِيْنُهُمْ) اور یہ کہ "سُفَهَاء" ہیں۔

اگرچہ دنیا نے جلد ہی اس "خودفریبی" اور "سفاہت" کی حقیقت دیکھ لی اور زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ تاریخ انسانی کا وہ حیرت انگیز انقلاب وجود میں آیا جس کی

---

(1) قریش نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے لفظوں میں یہ پیش کش کی تھی کہ اگر ہمارے معبودوں کے خلاف تنقیدیں کرنے سے باز آجائیں تو ہم نہ صرف یہ کہ آپ کی مخالفت ترک کر دیں گے بلکہ آپ کی خواہش مال و دولت بھی آپ کی خدمت میں لا کر ڈھیر کر دیں گے اور آپ کو اپنا سردار بلکہ بادشاہ بنالیں گے۔ (سیرت ابن ہشام - جلد اول)

منطقی توجیہ کرنے میں بڑی بڑی عقلیں دنگ ہیں۔ جن کو اپنے گھروں میں بھی سر چھپانے کی جگہ نہ ملتی تھی۔ قیصر و کسریٰ کے تاج ان کے قدموں پر آپڑے' اور ایک صدی بھی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ وہ یورپ' ایشیا اور افریقہ کے بیشتر حصوں پر چھا گئے۔ صرف ان کی زمینوں پر ہی نہیں بلکہ وہاں رہنے والوں کے دلوں اور دماغوں پر بھی۔ یہ سب کچھ یقیناً" اسی گہری فدویت اور وفاداری کے طفیل ہوا جو ان کے دلوں میں اپنے مقصد وجود اور اپنے اصول حیات کے لئے موجود تھی اور جس نے انھیں انہی کے لئے جینا اور مرنا سکھادیا تھا۔

مقصد شناسی کا زوال

اسلام کے اس ابتدائی دور کے گزر جانے کے بعد اس امت پر وہ دور آیا جب اس کے افراد کے ذہنوں میں اپنے مقصد زندگی کے نقوش ماند پڑنے شروع ہوئے۔ اور مختلف اسباب کے تحت ان کے اندر مداہنت کی بیماری جڑ پکڑنے لگی اور زمانے کے ساتھ ساتھ برابر ترقی کرتی گئی۔ غیر اسلامی اصول و نظریات مسلمانوں میں اس طرح پھیلنے لگے جیسے کسی دریا کا بند ٹوٹ گیا ہو۔ ان کی روک تھام کے لئے علمائے حق کی طرف سے بہت کچھ کوششیں بھی ہوتی رہیں۔ مگر ناتربیت یافتہ عوام کی خام مذہبیت اور حکومتوں کی نا فرض شناسی نے ان کوششوں کو پوری طرح کامیاب نہ ہونے دیا اور یہ بیماری مسلم معاشرے کے اندر آہستہ آہستہ اسلامی اصول و افکار کی جڑیں کھوکھلی کرتی رہی۔ جب تک اس جماعت کا سیاسی اقتدار قائم رہا اس وقت تک تو ان اصولوں کے بارے میں اس نے مجموعی حیثیت سے خود فراموشی اور خودکشی کی راہ نہیں اختیار کی۔ مگر جب سیاسی زوال نے بھی اسے آلیا تو اس فکری زوال کی تیز رفتاری سیلاب سے باتیں کرنے لگی۔ اور ہوتے ہوتے اب وہ وقت آپہنچا ہے کہ یہ جماعت اپنے آپ کو گویا پہچانتی بھی نہیں۔ اس کے افراد کی بہت بڑی اکثریت اپنے اصول و مقاصد اپنے مسلک اور اپنے وجود کی غرض و غایت کو اس طرح بھول چکی ہے کہ اگر ان چیزوں کو

سامنے رکھا جائے تو وہ نہ صرف یہ کہ ان سے اجنبیت محسوس کرتی ہے بلکہ بسا اوقات پورے اطمینان اور ادعائے تحقیق کے ساتھ اس کو غیر اسلام یا زائد از اسلام ثابت کرنے کی کوشش کرنے لگتی ہے جو چیزیں ان اصولوں کے بالکل مخالف ہیں وہ ان پر دیوانہ وار ٹوٹی پڑتی ہے اور انہیں مطابق اسلام قرار دینے پر مصر ہوجاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کی تمام تر جدوجہد اپنے ہی مقصد حیات کی پامالی میں صرف ہو رہی ہے۔ اگرچہ خوش فہمی یہ ہے کہ یہ سب کچھ اسلام اور امت مسلمہ کی سرفرازی کا باعث ہوگا بظاہر یہ محض ایک دعویٰ ہے مگر یہ دعویٰ ایسا ہے جو دلیل سے بے نیاز ہے۔ اللہ نے جس کسی کی پیشانی پر بھی دو آنکھیں دی ہیں وہ خود دیکھ سکتا ہے کہ حقیقت واقعہ اس کے سوا اور کچھ ہے ہی نہیں۔

اس سے انکار نہیں کہ ایک چھوٹی سی اقلیت ایسے لوگوں کی بھی اس جماعت میں موجود ہے جو بحمداللہ خود فراموشی اور خودکشی کے اس مقام تک ابھی نہیں پہنچی ہے بلکہ اس کی نگاہ اپنے نصب العین کے جلووں سے ابھی تک آشنا ہے اور وہ اسلام کے اصول و مقاصد کی یاد اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہے۔ لیکن انکار اس بات کا بھی تو نہیں کیا جا سکتا کہ اس خودشناس اقلیت کے بیشتر افراد کا حال بھی عملی نقطہ نگاہ سے کچھ قابل اطمینان نہیں اور ان کے اندر یہ یاد محض ایک متبرک یادگار بن کر رہ گئی ہے۔ جس میں زندگی کی حرارت یا تو رہی نہیں یا اتنی مدھم پڑ چکی ہے کہ محسوس نہیں ہوتی۔ حالات کی ناسازگاری اور مخالف قوتوں کی قہاری نے ان کے سروں میں وہ سودا ہی باقی نہیں رہنے دیا جس کے بغیر کسی بڑے مقصد اور اصول کا نام لینا کچھ زیب نہیں دیا کرتا۔ اس لئے ان لوگوں نے بھی خاموش مصالحت کی پرامن روش اختیار کر رکھی ہے اور اس بات کی احتیاط رکھنا گویا ان کی مستقل پالیسی بن گئی ہے کہ ان پر "سیاست وتدبر" کی طرف سے "مذہبی مجنون" ہونے کاالزام نہ لگنے پائے۔ وہ دیکھتے اور جانتے سب کچھ ہیں مگر اپنے کو یہ "سمجھا کر" خاموش ہیں کہ دین میں آسانی رکھی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کسی شخص کو اس طاقت سے زیادہ مکلف نہیں قرار دیا ہے بلکہ ایسے

اقدام و عمل سے باز رہنے کی وصیت فرمائی ہے جس میں ہلکے ہوں۔

امت "نعمت بقدر رحمت" کے قانون کی زد میں

ان حالات میں یہ جماعت اگر آج دنیوی جاہ و اقبال کی مالک ہوتی تو بھی اسلام کو اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ کیونکہ اس کا جو سیاسی اقتدار اس کی نظروں میں کوئی وقعت رکھتا ہی نہیں۔ اس کو تو جو کچھ بحث اور دلچسپی ہے صرف اپنی اطاعت سے ہے اس نصب العین کو پس پشت ڈال کر اس کے نام لینے والوں نے ہفت اقلیم کی شہنشاہی بھی حاصل کر لی تو اس کے کس کام کی؟ مگر قدرت نے یہ چیز بھی تو آج ان کے پاس باقی نہیں رہنے دی۔ انہوں نے اپنے مقصد وجود کو دیوار پر پھینک کر جو کچھ پایا وہ محکومی یا نیم محکومی کا وہ داغ ہے جو ہر جماعت کی پیشانی پر تو لگ سکتا ہے مگر سلطان کائنات کی پارٹی .... حزب اللہ کی پیشانی پر ہرگز نہیں لگ سکتا۔ یہ داغ اتنا گھناؤنا ہے کہ ہر دیکھنے والے کو اس پر حیرت ہوتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ امت کے ابتدائی دور میں اس کے عروج کو دیکھ کر حیرت ہوا کرتی تھی یعنی عروج و زوال کے عام فلسفے کی رد سے امت مسلمہ کا عروج بھی ایک معجزہ تھا اور اب اس کا زوال بھی ایک "جوابی معجزہ" ہے۔ عقلیں نہ اس غیر معمولی اقبال کی کوئی اطمینان بخش توجیہہ کر پاتی ہیں اور نہ اس غیر معمولی ادبار کی .... حد یہ ہے کہ خود اس امت کی بہت بڑی اکثریت بھی حیرت زدہ ہے کہ یہ کیا ہے کیا ہو گیا؟ وہ رہ رہ کر یہ سوچتی ہے کہ آخر ہماری ایسی زبوں حالی کا سبب کیا ہے؟ ہمیں یہ تسلیم ہے کہ ہمارے ایمان میں کمزوری آگئی ہے ہم بد عمل ہو گئے ہیں۔ ہمارے اخلاق تباہ ہو چکے ہیں۔ ہم احکام دین سے غافل ہیں۔ یہ سب کچھ سہی مگر پھر بھی برے بھلے جیسے ہیں آج اس دنیا میں صرف ہم توحید کے تنہا علم بردار ہیں۔ ہم اگر سر جھکاتے ہیں تو خدا ہی کے سامنے جھکاتے ہیں اس کے رسولؐ پاک کا حلقۂ اطاعت ہے تو صرف ہماری گردنوں میں ہے اس کے احکام پر اگر کچھ عمل کرتے ہیں تو ہم ہی کرتے ہیں .... اور ہمارے

بالمقابل ساری دنیا کافر و مشرک ہے۔ خدا کی باغی اور توحید کی منکر ہے۔ رسولؐ کی مخالف اور قرآن کی دشمن ہے پھر یہ کیا بات ہے کہ ہم پست اور وہ سربلند، ہم مفلس اور وہ دولت مند، ہم ذلیل و خوار اور وہ صاحب اقتدار، ہم غلام و محکوم اور وہ آزاد و حکمراں! حالانکہ جب ہم بہرحال غیروں کی بہ نسبت اللہ سے زیادہ قریب ہیں تو ان کے مقابلے میں ان الٰہی انعامات کے زیادہ مستحق ہم تھے کہ نہ وہ۔

یہ حیران کن سوال دراصل اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ ہم قوموں کے عروج و زوال کے اس فلسفے سے ناواقف ہو گئے ہیں۔ جسے قرآن حکیم نے بیان فرمایا ہے۔ ورنہ طبعی اور اخلاقی دونوں حیثیتوں سے ہم ٹھیک اسی مقام پر ہیں جہاں ہونا چاہئے تھا۔ صورت واقعہ یہ ہے کہ زندگی کے میدان میں دو قسم کے قوانین کارفرما ہیں ایک تو قوانین طبعی دوسرے قوانین اخلاقی(1) قوموں کے اٹھانے اور گرانے میں یہ دونوں ہی قسم کے قوانین کام کرتے ہیں۔ مگر دونوں میں ایک فرق ہے اور وہ یہ کہ تنہا قوانین طبعی تو ایک قوم کو میدان مقابلہ میں فتح و غلبہ دلا سکتے ہیں۔ لیکن قوانین اخلاقی میں مشیت نے یہ قوت نہیں رکھی ہے کہ وہ طبعی قوانین کی تھوڑی بہت مدد لئے بغیر بھی اکیلے ہی کسی قوم کو غالب و فتح مند بنا دیں۔ قوانین اخلاق کو دراصل قوموں کی باہمی کشکش اور جنگی معرکوں میں "خصوصی اختیار فیصلہ" کا مقام حاصل ہے اور اس خصوصی اختیار کا استعمال وہ طبعی قوانین اور مادی قوتوں کی موجودگی ہی میں کرتے ہیں یعنی اگر دونوں فریق جنگ صرف مادی تیاریوں کے ساتھ نبرد آزما ہوں تو فتح اس کی ہو گی جو

---

(1) "اخلاق" سے یہاں مراد حقیقی دینی اخلاق ہیں نہ کہ افادی اور تجربی اخلاق۔ ورنہ افادی اخلاقیات سے بھی کوئی قوم اگر بے بہرہ ہو تو وہ محض طبعی قوانین کے بل پر غلبہ نہیں حاصل کر سکتی۔ اس جگہ افادی اخلاقیات کو بھی طبعی قوانین ہی کے اندر شمار کیا گیا ہے۔ کیونکہ وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے مادی تدابیر کے سوا کچھ نہیں۔ انہیں اخلاق کہنا ہی سرے سے غلط ہے۔

لڑائی کے اسباب و ذرائع زیادہ لے کر میدان مقابلہ میں آیا ہو گا اور اگر ایک طرف صرف مادی قوتیں ہوں اور دوسری طرف محض اخلاقی اور روحانی قوتیں ہوں تو فریق ثانی کا شکست کھانا یقینی ہے بلکہ اسباب و علل کی اس دنیا میں فی الواقع یہ مقابلہ کوئی مقابلہ ہی نہیں۔ لیکن اگر مادی تدابیر اور اسباب و ذرائع کے اعتبار سے دونوں فریق برابر ہوں مگر ساتھ ہی ایک فریق اخلاقی قوتوں سے بھی مسلح ہو تو بلاشک و شبہ اسی کو غلبہ حاصل ہو گا اور ان کی اخلاقی قوتیں بڑھ کر اس جنگ کا فیصلہ اسکے حق میں کر دیں گی۔ جسے فریقین کے یکساں مادی سروسامان کے باعث بظاہر کبھی ختم ہی نہ ہونا چاہئے تھا۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر قرآنی تصریحات تو یہاں تک بتاتی ہیں کہ اگر مادی وسائل میں وہ فریق مخالف کا دسواں حصہ ہو تو بھی اس کی اخلاقی قوتیں خصوصی "اختیار فیصلہ" بن کر اسے فتح یاب بنا دیتی ہیں اور یہ اس طرح ہوتا ہے کہ یہ قوتیں اللہ تعالیٰ کی غیبی مدد اور مافوق الطبیعی نصرت کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ بشرطیکہ ایک طرف تو اس نے اپنے مقدور بھر مادی وسائل اور تدابیر سے کام لینے میں دریغ نہ کیا ہو اور دوسری طرف اپنے ایمان کو خوب راسخ اور اپنے اعمال کو صالح بنا لیا ہو۔ یا یوں کہئے کہ اس کے اندر اپنے اصولوں کا حقیقی عشق اور اپنے مسلک زندگی کا زندہ جنون موجود ہو۔ اس غیبی مدد اور مافوق الطبیعی نصرت کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے صریح وعدے کئے گئے ہیں مثلاً":

(۱) كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً ۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ (بقرہ۔ ۲۴۹)

(۲) وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔ (آل عمران۔ ۱۳۹)

کتنی ہی چھوٹی جماعتیں بڑی جماعتوں پر اللہ کے حکم سے غالب ہوتی ہیں

نہ سست پڑو اور نہ غمگین ہو۔ تم ہی اونچے رہو گے بشرطیکہ تم مومن ہو۔

(۳) اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ۔ (انفال۔ ۶۵)

اگر تمہارے بیس ثابت قدم اشخاص ہوں گے تو وہ دو سو پر غالب آجائیں گے۔

(۴) اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ (انبیاء۔ ۱۰۵)

یقیناً" زمین کے وارث میرے صالح بندے ہوں گے۔

(۵) وَمَنْ يَتَوَلَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ (مائدہ۔۵۶)

اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کو اور مومنوں کو اپنا ساتھی بنائے گا تو (وہ با مراد اور سربلند ہو گا) بے شک اللہ کی جماعت ہی غالب رہنے والی ہے۔

اس غیبی مدد کے ظہور کی مثالیں ہر دور میں پائی جا سکتی ہیں۔ خود اس امت کی ابتدائی تاریخ اس قسم کے واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ بدر و احد اور احزاب و حنین کے معرکوں میں خدا کی ان دیکھی فوجوں نے جو کرشمے انجام دیئے' قرآن کے صفحوں میں وہ آج بھی محفوظ ہیں۔

یہ ہے مخصوص ضابطہ کسی مومن گروہ کے عروج کا" اور یہی مخصوص ضابطہ تھا جس نے امت مسلمہ کا ابتدائی دور غیر معمولی عظمت اور سربلندی کا دور بنا دیا تھا۔

لیکن جہاں دوسری اہل ایمان جماعتوں کی طرح اس جماعت کو بھی قدرت کی یہ خصوصی نظر عنایت حاصل ہے وہیں اس کی ذمے داریاں بھی بہت نازک ہیں اور اس کے اس خاص وعدے کے ساتھ ایک خاص وعید سے بھی با خبر کیا جا چکا ہے جس کی طرف سے افسوس ہے کہ اس نے اپنے کان بند کر لئے ہیں اور یہی کان بند کر لینا ہی دراصل اس کے لئے غلط فہمیوں اور ہلاکتوں کا باعث بنا ہے۔ اور وہ سوال پیدا کر دیا گیا ہے جس کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں۔ اس اجمال کی شرح یہ ہے کہ قرآن نے اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور نعمتوں کا جو قانون بیان فرمایا ہے اس کی رو سے جس فرد یا گروہ پر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم جتنا ہی زیادہ ہوتا ہے اس فضل وکرم کی ناشکری یعنی احکام الٰہی سے بے پروائی برتنے پر اس کی پکڑ بھی اتنی ہی زیادہ سخت اور ہولناک ہوتی ہے محکومی و نامرادی کی جتنی سزا وہ دوسری قوموں کو برے اعمال کی پاداش میں دیا کرتا ہے اتنے برے اعمال کے ارتکاب پر اس قوم کو اس سے دوگنی یا کئی گنی سزائیں دیتا ہے جو اس کے کچھ مخصوص انعامات سے سرفراز کی جا چکی ہو۔ قرآن حکیم کی چند شہادتیں سنئے۔

سب سے پہلے خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات عالی مقام کو لے لیجئے۔ جن سے بڑھ کر محبوب اور مقرب بندہ عالم وجود میں آیا ہی نہیں۔ مگر یہ بات اس محبوب ترین بندے کو مخاطب کرکے کہی گئی تھی کہ :

وَ لَوْ لَا اَنْ ثَبَّتْنٰکَ لَقَدْ کِدْتَّ تَرْکَنُ اِلَیْهِمْ شَیْئًا قَلِیْلًا ۔ اِذًا لَّاَذَقْنٰکَ ضِعْفَ الْحَیٰوةِ وَ ضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَکَ عَلَیْنَا نَصِیْرًا ۔ (بنی اسرائیل ۔ ۷۴)

اگر ہم تم کو (حق پر) ثابت قدم نہ رکھتے تو قریب تھا کہ تم کفار کی طرف کچھ نہ کچھ جھک پڑتے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو یقیناً ہم اس وقت تم کو زندگی اور موت دونوں میں (یعنی دونوں جہان میں) دوہرا عذاب چکھاتے پھر تم ہمارے خلاف کسی کو اپنا مددگار نہ پاتے۔

دوسری مثال ازواج مطہراتؓ کی لیجئے۔ ان کو جہاں یہ رتبہ بخشا گیا تھا کہ وہ امہات المومنین ہیں اور ان کی حیثیت عام عورتوں جیسی نہیں ہے (یا نساء النبی لستن کاحد من النساء) (احزاب ۔ ۳۲) نیز یہ کہ اگر وہ اللہ اور اس کے رسول کی صدق دل سے تابعداری کریں اور اچھے کام کریں تو عام لوگوں کی بہ نسبت ان کو دوگنا اجر ملے گا۔ وَمَنْ یَّقْنُتْ مِنْکُنَّ لِلّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَا اَجْرَهَا مَرَّتَیْنِ وَ اَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا کَرِیْمًا (احزاب ۔ ۳۱) وہیں اس حقیقت سے بھی انہیں آگاہ کر دیا گیا تھا کہ :

یٰا نِسَاءَ النَّبِیِّ مَنْ یَّاْتِ مِنْکُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَیِّنَةٍ یُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَیْنِ (احزاب ۔ ۳۰)

اے نبی کی بیویو! تم میں سے جو کوئی کھلی ہوئی بے حیائی کی مرتکب ہو گی اس کو دوگنا عذاب دیا جائے گا۔

افراد بعد قوموں کی مثال لیجئے۔ یہودی قوم وہ قوم ہے جس پر مدتوں انعامات الٰہی کی بارشیں ہوتی رہیں۔ جس کو دشمن سے بچانے کے لئے سمندر خشک کر دیا گیا۔ جس

کی معاشی مشکلات کے وقت من و سلویٰ کا نزول ہوتا رہا۔ لق و دق بیابانوں میں جس کے سر پر رحمت کے فرشتے بدلیوں کی چھتریاں تانے ساتھ ساتھ چلتے تھے اور جس کو تمام اقوام عالم پر برتری دی گئی تھی۔ لیکن جب اسی سربلند اور محبوب جماعت اور موجودہ توریت کے لفظوں میں "خدا کی اپنی قوم" نے اپنے عہد بندگی کو فراموش کردیا' اور احکام الٰہی سے سرتابی کرکے فسق و فجور میں غرق ہوگئی تو اس پر اللہ کا غضب ٹوٹ پڑا۔ اور اس طرح ٹوٹا کہ یہ قوم پہلے جتنی سربلند تھی اب اتنی ہی ذلیل ہوگئی۔ جس قدر محبوب تھی اسی قدر مغضوب ہو رہی۔

غرض یہ اللہ تعالیٰ کی ایک کبھی نہ بدلنے والی سنت ہے کہ اس کی نعمت بقدر رحمت ہوا کرتی ہے اور جیسا کہ چاہئے' یہ سنت ٹھیک ٹھیک عدل پر مبنی ہے چنانچہ عام انسانی فطرت بھی اسی روش پر عمل پیرا ہے۔ ہم ایک اجنبی آدمی سے اس حسن سلوک کے امیدوار نہیں ہوتے جس کی امید ہمیں اپنے اعزہ سے ہوتی ہے۔ ایک غیر شخص اگر ہماری باتوں کو نہیں مانتا' یا اس کی تکذیب اور مخالفت کرتا ہے تو ہم اس پر زیادہ رنجیدہ یا مشتعل نہیں ہوتے۔ لیکن یہی بات اگر اپنے کسی نمک خوار نوکر یا ناز پروردہ بیٹے سے سرزد ہو جائے تو اس وقت ہمارے غم و غصہ کی انتہا نہیں رہتی۔ اور ہم اس کی اس حرکت کا وہ جواب دیتے ہیں جو ایک غیر آدمی کو کبھی نہیں دیے سکتے۔ اس فرق کی وجہ بالکل کھلی ہوئی ہے۔ غیر کی مخالفت کا مطلب زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ وہ ایک سچی بات کا منکر اور دشمن ہے لیکن اس یگانے کی مخالفت کا مطلب یہ ہے کہ اس میں مخالفت حق کے ساتھ نمک حرامی بھی موجود ہے۔ اور یہ وہ جرم ہے جسے انسانیت کا ضمیر کبھی معاف نہیں کرتا۔ بالکل یہی اصول اللہ تعالیٰ بھی اپنے بندوں کے بارے میں برتتا ہے اور ان افراد یا قوم کو جو اس کی مخصوص عنایتوں سے سرفراز ہونے کے باوجود اس کے احکام کی مخالفت پر اتر آتی ہیں عام حالت کی بہ نسبت دوگنی سزائیں دیتا ہے۔ کیونکہ وہ بیک وقت دو جرموں کی مرتکب ہوتی ہیں۔ ایک تو مخالفت حق کی دوسرے احسان کشی اور نمک حرامی کی۔

اسی سنت الٰہی کی روشنی میں امت مسلمہ کے ماضی اور حال کا جائزہ لینا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کا اس امت کے ساتھ کیا معاملہ رہا ہے؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ اس نے اس امت کو تقریباً وہ ساری نعمتیں بھی بخشیں جو اس سے پہلے دوسری تمام امتوں کو دی گئی تھیں۔ اور ان کے علاوہ وہ نعمتیں بھی جو اب تک کسی امت کو نہیں ملی تھیں۔ آخر یہ سارے جہان کی امامت کا منصب[1] اور سب سے بہتر امت[2] ہونے کا اعزاز' یہ امت[3] وسط اور شہداء علی الناس[4] کے خطابات' یہ .... اکمال[5] دین اور اتمام[6] نعمت کے انعامات اس سے پہلے بھی کسی امت کو ملے تھے؟ اگر نہیں اور یقیناً" نہیں تو پھر غور کیجئے کہ اس امت کی ذمہ داریاں کتنی بھاری ہوں گی؟ اور اس ذمے داریوں کو چھوڑ بیٹھنے کے نتائج کتنے خطرناک ہو سکتے ہیں؟ جزا و سزا کا جو قانون اللہ تعالیٰ کے محبوب ترین پیغمبرؐ اور پیغمبرؐ کی محترم ازواجؓ کے حق میں بھی اتنا بے لچک تھا وہ دوسروں کے بارے میں کوئی نرمی دکھا سکتا ہے؟ اگر "اس بہترین امت" کا عملی ریکارڈ ویسا ہی یا قریب قریب ویسا ہی ہے جس کے لیے وہ مبعوث کی گئی تھی تو یقیناً" اسے اپنی موجودہ زبوں حالی پر تعجب کرنے کا پورا حق ہے۔ لیکن اگر وہ اپنے مقصد وجود سے غافل ہو چکی ہے تو پھر اسے تعجب اپنی حالت پر نہیں' بلکہ اپنی سادہ لوحی

(۱' ۲) كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ الخ (آل عمران - ۱۱)
تم بہترین امت ہو جو تمام لوگوں کی (امامت و رہنمائی) کے لئے برپا کی گئی ہے۔ الخ

(۳' ۴) وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (بقرہ - ۱۴۳)
اور اسی طرح ہم نے تم کو ایک معتدل امت بنایا ہے تاکہ تم سب لوگوں کے لئے حق کے گواہ بنو۔

(۵' ۶) اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ (مائدہ - ۳) آج میں نے تمہارے لئے دین کو مکمل کر دیا' اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی۔

اور اپنی خوش فہمی پر کرنا چاہئے۔ آخر قدرت نے کب اور کس پر ظلم کیا ہے' جو آج وہ اس امت کے بارے میں انصاف کو بھول گئی ہو گی اور بھول کر اسے بلاوجہ پستی کے گڑھے میں دھکیل گئی ہو گی۔ ذرا دیکھ تو لیجئے کہ اس امت کی ذمے داری کیا تھی؟ اور اس وقت وہ اسے ادا کس طرح کر رہی ہے؟ اس کی ذمے داریوں کا ضروری تعارف تو اگرچہ ابھی پچھلے باب میں نظروں سے گزر چکا ہے لیکن مناسب ہو گا کہ بعض اور تصریحات بھی سن لی جائیں۔ قرآن مجید مسلمانوں سے کہتا ہے کہ:

اِتَّبِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِن دُونِهِ أَوْلِيَاءَ

تمہارے رب کی طرف سے جو کچھ نازل ہوا ہے اس کی پیروی کرو اور اسے چھوڑ کر (دوسرے جھوٹے) خداوندوں کا اتباع نہ کرو۔

مسلمانوں کا کیا رویہ ہونا چاہئے اور اسے کارزار حیات میں کونسا کردار ادا کرنا ہے؟ قرآن مجید کا صرف یہی ایک جملہ اس سوال کا مثبت اور منفی ہر پہلو سے واضح جواب دے دیتا ہے اس سے یہ بھی صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اسے کیا کرنا چاہئے اور یہ بھی کہ کیا نہ کرنا چاہئے؟ ایک طرف تو ہر وہ حکم اور ہدایت جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہو اس کے لیے واجب التعمیل ہے۔ خواہ اس کا تعلق عقائد اور عبادات سے ہو خواہ اخلاق اور معاملات سے' انفرادی مسائل سے ہو یا اجتماعی سے' مسجد اور مدرسہ سے ہو یا گھر اور بازار سے' اسمبلی اور پارلیمنٹ سے ہو یا بزم صلح اور میدان جنگ سے۔ غرض کوئی موقع ہو یہی احکام و ہدایات اس کے نظریوں کی بنیاد ہوں گے۔ یہی اس کے رویے کا فیصلہ کریں گے۔ اور انہی کا پابند ہو کر اسے رہنا پڑے گا۔ دوسری طرف اپنے اس حقیقی مالک کے سوا (اور اس کے بھیجے ہوئے پیغمبر کے علاوہ) اگر کسی اور جانب سے کوئی نظریہ کوئی اسوہ' کوئی ضابطہ اور کوئی فیصلہ اس کے سامنے آتا ہے تو وہ لازماً اس کے لیے قابل رد ہے۔ جیسا ضروری اس کے لیے یہ ہے کہ وہ اپنے رب کے ہر حکم کو بجا لائے ٹھیک ویسا ہی ضروری امر یہ بھی ہے کہ ہر بیرونی شے کو دیوار پر دے مارے۔

قرآن کے اس مطالبے کو سننے کے بعد دو ہی راہیں اختیار کی جاسکتی ہیں' یا تو اس کا انکار کر دیا جائے' یا پھر غیر مشروط طریقے پر سر تسلیم خم کر دیا جائے۔ انکار کرنے کے معنی جس طرح یہ ہیں کہ انسان قرآن کو حق نہیں مانتا اور امر و حکم کو اللہ تعالیٰ ہی کے لیے مخصوص نہیں سمجھتا' اسی طرح اس مطالبے کو غیر مشروط طریقے پر تسلیم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ تسلیم کرنے والا قرآن کو برحق تو مانتا ہی ہے وہ اس بات کا بھی اقرار و اعلان کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کسی ایک ہدایت کی بھی پابندی سے گریز نہ کرے گا۔ یہ ایک بالکل کھلی ہوئی اور سادہ سی حقیقت ہے کہ جس سے کسی اختلاف کی بابت سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ اب اس حقیقت کے ہوتے ہوئے دین کی صرف بعض پابندیوں کو قبول کرنے اور بعض سے کترا کر نکل جانے کا رویہ جتنا غیر معقول اور مضحکہ خیز ہو سکتا ہے اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں' جہاں تک قرآن کا تعلق ہے اس نے تو ایسی بین بین کی روش اختیار کرنے والوں کو اپنا فیصلہ ان صاف اور صریح لفظوں میں سنا رکھا ہے۔

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ (بقرہ - ۸۵)

کیا تم کتاب الٰہی کی بعض باتوں کو مانتے ہو اور بعض کو نہیں مانتے۔ سو ایسا کرنے والوں کی سزا اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ دنیا میں ذلیل و خوار ہوں اور آخرت میں شدید ترین عذاب کی طرف لے جائے جائیں۔

قرآن کا یہ فیصلہ اس امر کا قطعی ثبوت ہے کہ اس کا مطالبہ کامل حوالگی کا ہے۔ یعنی وہ کچھ بھی کہے اس پر اور صرف اسی پر عمل ہونا ضروری ہے۔ اس نے اپنے پیروں کے لئے زندگی کے مختلف شعبوں میں جو حدیں قائم کر دی ہیں۔ ان کے آگے قدم اٹھانے کی ان کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ ایسا کرنے والوں کو وہ ظالم قرار دیتا ہے۔ (وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (بقرہ - ۲۲۹) اس لئے

قرآن پر ایمان لانے اور مسلم ہونے کے مطلب یہ ہوا کہ اس کے اندر جو کچھ ہے اس کے کسی ادنٰی سے ادنٰی جزو کو بھی ترک نہیں کیا جا سکتا۔

اب ذرا اک سرسری نظر سے یہ بھی دیکھ ڈالئے کہ یہ امت اپنی اس ذمے داری کو پورا کس طرح کر رہی ہے؟ دماغ کو تمام خارجی تاثرات سے آزاد کر کے "مَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ" پر اول سے آخر تک نظر ڈال جائیے اور اس کے بعد امت کے پورے عملی رویے کا گہرا جائزہ لیجئے۔ پھر اندازہ کیجئے کہ قرآن کے احکام پر عمل ہو رہا ہے؟ چھوڑ دیجئے ان لوگوں کو جو "مسلمان" ہوتے ہوئے بھی اسلام کے اعلانیہ باغی اور اس کے اصولوں کی سچائی کے منکر ہیں۔ یا جن کی زندگی کے لحات ایک ایک کر کے اسلامی قوانین کے توڑنے بلکہ مٹانے ہی میں صرف ہوتے رہتے ہیں اور جن کو فقہی اصطلاح میں فاسق و فاجر کہا جاتا ہے ان افراد اور حلقوں کی طرف نگاہ دوڑائیے جو نیکی اور تقویٰ اور ایمان و عمل کے لحاظ سے اگلی صفوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ یہاں بھی آپ کو جو کچھ دکھائی دے سکتا ہے وہ زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا کہ ان احکام الٰہی سے جن کا تعلق انفرادی زندگی سے ہے وہ غفلت نہیں برتتے' نمازوں اور روزوں کی پوری پوری پابندی ہوتی ہے اور وظائف کی کثرت ہے' زکوٰۃ و صدقات ادا ہو رہے ہیں۔ جھوٹ' غیبت' بدگوئی اور بہتان تراشی سے زبان آلودہ ہونے نہیں پاتی۔ کبر و غرور' نمود و ریا' خیانت' ظلم اور غضب' رشوت اور حرام خوری' اور فتنہ و فساد کے دھبوں سے ان کے ایمان کا دامن پاک رہتا ہے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود جہاں تک دین کے اجتماعی احکام و مسائل کا تعلق ہے اس سے غفلت و بے اعتنائی کا حال ان حلقوں میں بھی وہی ہے جو غیر متقی حلقوں میں نظر آتا ہے۔ قرآن نے اگر زندگی کے صرف انفرادی پہلو سے ہی بحث کی ہوتی تب تو بلاشبہ اس طرح اتباع قرآن کا حق ادا ہو جاتا۔ مگر وہ تو زندگی کے اجتماعی مسائل کو بھی اتنی ہی اہمیت کے ساتھ لیتا ہے جتنی اہمیت سے اس نے انفرادی مسائل کو لیا ہے۔ اس نے نماز' روزے' حج اور زکوٰۃ کے فرائض ادا کرنے اور دیانت' امانت' راست گوئی' اخلاص' وفائے عہد' حسن سلوک'

اکل حلال وغیرہ اخلاق فاضلہ پر کار بند ہونے کی ہدایتیں دینے کے ساتھ ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی بھی عبادت کے لائق اور آقائی و فرمانروائی کا مستحق نہیں۔ اس لئے اسی کو اپنا آقا اور سلطان مانو (لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ) (اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ) - (یوسف ۴۰) اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (اعراف - ۵۴) خدا ہی کی بندگی کرو اور تمام باطل معبودوں کو چھوڑ دو۔ (اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (نحل-۳۶) خدائی اور فرمانروائی کے ان تمام جھوٹے مدعیوں کے دعوے تسلیم کرنے سے انکار کر دو' جو خدا کی بادشاہت سے باغی ہو کر اس کی رعایا پر اپنا حکم چلانا چاہتے ہیں۔(وَقَدْ اُمِرُوْا اَنْ یَّکْفُرُوْا بِہٖ (نساء - ۶۰) ان لوگوں کا کہنا نہ مانو جو اللہ کے حقوق سے غافل اور اس کی حدود کو توڑنے والے ہیں۔ وَلَا تُطِیْعُوْا اَمْرَ الْمُسْرِفِیْنَ۔ (شعراء - ۱۵۱) جب فیصلہ کرو تو احکام الٰہی کے مطابق کرو۔ (وَاَنِ احْکُمْ بَیْنَہُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰہُ (مائدہ - ۴۹) جب اپنا فیصلہ کراؤ تو انہی احکام کے تحت کام کرنے والی عدالتوں سے کراؤ۔ ورنہ غیر الٰہی قوانین کی عدالت میں اپنا معاملہ لے جانے والا منافق ہے۔ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاکَمُوْا اِلَی الطَّاغُوْتِ (نساء - ۶۰) اور قوانین الٰہی کو چھوڑ کر ان قوانین کے مطابق فیصلہ کرنے والا' ظالم' فاسق اور کافر ہے (وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الْکَافِرُوْنَ.......... الظَّالِمُوْنَ.......... اَلْفَاسِقُوْنَ (مائدہ - ۴۴ تا ۴۷) کسی برائی اور کسی ظلم کو پروان چڑھانے میں کسی طرح کا تعاون نہ کرو۔ (لا تعاونوا علی الاثم و العدوان (مائدہ - ۲) کفر کے علم برداروں سے لڑو' یہاں تک کہ کفر کا علم سرنگوں ہو جائے اور اللہ ہی کی اطاعت رہ جائے۔ (وَقَاتِلُوْہُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰہِ (بقرہ - ۱۹۳) .... جو کوئی اللہ اور اس کے رسول سے لڑے اس سے خدا کی زمین پر زندہ رہنے کا حق چھین لو۔ اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْا (الخ مائدہ - ۳۳) جو چوری کرے اس کے ہاتھ کاٹ دو وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَۃُ فَاقْطَعُوْا اَیْدِیَہُمَا (مائدہ - ۳۸) جو بدکاری

کرے اس کو سو کوڑوں کی سزا دو۔ (اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ (نور ۔ ۲) جو کوئی کسی پاک دامن پر زنا کا جھوٹا الزام لگائے اس کو اسی (۸۰) درے لگاؤ (وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوْا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمَانِيْنَ جَلْدَةً (نور ۔ ۴) جو کوئی کسی کو عمداً قتل کر دے اس کی بھی گردن اڑا دو (يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ (بقرہ ۔ ۱۷۸) غرض یہ اور انہی جیسے بے شمار احکام شریعت ایسے بھی ہیں جو ہماری انفرادی زندگی سے آگے بڑھ کر ہماری اجتماعی زندگی کو بھی اپنا پابند بنا کر رکھنا چاہتے ہیں اور یہ سب کے سب اسی قرآن میں موجود ہیں' جس میں نماز روزے کے احکام درج ہیں اس لئے جب تک ان احکام پر بھی عمل نہ کر لیا جائے یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اتباع دین اور عمل بالقرآن کا حق ادا ہو رہا ہے اس حقیقت کے پیش نظر اس جماعت کے لئے جس نے اللہ کی کتاب پر پورا پورا عمل کرنے کا عہد کیا ہے یہ سارے احکام بھی بالیقین اسی طرح واجب التعمیل ہیں جس طرح وہ دوسری قسم کے احکام۔ بلکہ امر واقعی تو یہ ہے کہ اپنی ساری اہمیتوں کی بنا پر ان میں سے اکثر احکام ایسے ہیں جو مدار ایمان اور شرط نجات ہیں۔ اس لئے وہ ایک مسلمان کے لئے اولین توجہ کے مستحق ہیں۔ لیکن "خالص دینی اور متقی حلقوں" میں بھی ان پر عمل کا سراغ ملنا تو درکنار' عمل کی خواہش کا وجود بھی تقریباً" نایاب سا ہے۔ آج ہمارا معبود اور شہنشاہ اللہ تعالیٰ ضرور ہے مگر مسجد کی چار دیواریاں اس کی معبودیت اور شہنشاہیت کی آخری حدیں ہیں اور مسجد سے باہر ہمارے آقا و حکمراں وہ لوگ ہیں جو ہماری ہی طرح مخلوق ہیں۔ اور خود بھی اسی ایک حاکم حقیقی کے قانون کی پیروی کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ ان میں سے اکثر تو وہ ہیں جو اللہ رسول کے علانیہ باغی اور کفر و ضلال کے امام ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جو مسلمان ہیں۔ لیکن ایسے مسلمان جنہوں نے اللہ کے ان حقوق فرمانروائی کو جن کا تعلق دنیا میں انسانوں کی اختیاری زندگی سے ہے اپنے ہاتھوں میں لے لیا ہے۔ قریب قریب پوری امت مسلمہ انہی دو قسم کے "اَرْبَابًا"

مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ" کو اپنا صاحب امر و حکم بنائے ہوئے ہے۔ اب اس کے لئے قانون وہ ہے جو یہ خداوند ارضی نافذ کریں۔ نہ کہ وہ جو کتاب و سنت میں ہے پھر جب انسانی زندگی کے ایسے بنیادی مسئلے میں اس امت نے پہلے مداہنت کی اور بالآخر تعاون کی پالیسی اختیار کرلی اور اپنے ہی جیسے انسانوں کے ہاتھوں میں اپنے نظام سیاست کی باگیں دے کر انہی کو اپنا صاحب امر تسلیم کرلیا تو اس کے وہ بہت سے مسائل زندگی جن کا تعلق براہ راست حکومت سے ہوا کرتا ہے آپ سے آپ غیر اسلامی بنیادوں پر طے ہونے لگے۔ اب اس کے کتنے ہی اصول زندگی .... اس کے سیاسی نظریات' اس کے معاشی تصورات اور اس کے عمرانی افکار .... کی بنیاد ہی بدل گئی اور اس کی زندگی کا پورا ڈھانچہ اور مسائل زندگی پر غور و فکر کرنے کا طرز ہی کچھ اور ہوگیا۔ اب وہ اللہ وحدہ' لاشریک لہ' کی غیر منقسم حاکمیت کی بجائے انسانوں کی حاکمیت کی داعی اور علم بردار ہے۔ اب وہ اس نظام زندگی کو' جو اپنے اصول و فروغ میں سر تا پا غیر اسلامی' غیر قرآنی بلکہ کافرانہ ہے نہ صرف انگیز کر رہی ہے بلکہ اس کی مشین چلانے میں مسابقت دکھا رہی ہے اب اس کے افراد نہایت اطمینان کے ساتھ اللہ کے نازل کردہ قوانین کو چھوڑ کر انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق فیصلہ کرتے اور کراتے ہیں۔ حالانکہ انھیں علم ہے کہ اس معاملہ میں اللہ کا حکم یہ نہیں ہے۔ اب ارتداد' چوری' زنا' بہتان اور قتل کے جرائم کی سزائیں کہیں بھی وہ نہیں دی جاتیں جو کتاب و سنت میں مقرر ہیں حالانکہ انہوں نے اپنے فرمانروائے حقیقی سے عہد کیا تھا اور وفاداری کا حلف اٹھایا تھا کہ ہم ان تعزیرات کو جاری کریں گے اس طرح قرآن کا ایک بڑا حصہ صرف کتابت اور تلاوت کے لئے محدود ہو کر رہ گیا ہے اور اس کے ماننے والوں کی عملی زندگی سے اس کا کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔ اگر ہمارے اندر قرآنی تعلیمات کا سچا فہم اور اسلام کی صحیح بصیرت موجود ہو' اور نفس کی چالبازیوں نے ہماری روح ایمانی کو تھپکیاں دے کر سلا نہ دیا ہو تو یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ قرآن کے ساتھ ہم بڑی حد تک وہی سلوک کر رہے ہیں جو اہل کتاب نے توراۃ اور انجیل کے ساتھ کیا تھا۔ البتہ

قرآن اللہ تعالیٰ کا چونکہ آخری ہدایت نامہ تھا جس کے باعث اس نے خود اس کی حفاظت کا وعدہ کر رکھا ہے اس لئے یہ تو ممکن نہیں کہ گزشتہ آسمانی کتابوں کی طرح اس کتاب میں بھی لفظوں کا ردوبدل اور عبارتوں کی کاٹ چھانٹ کی کوئی جسارت کامیاب ہو سکے۔ لیکن اس کے علاوہ اور کوئی ظلم اور خیانت ایسی نہیں ہے جو دوسری امتوں نے اپنے صحیفوں کے ساتھ روا رکھی ہو اور مسلمان اس سے باز رہے ہوں عملی طور پر انہوں نے قرآن کے ایک حصے کو فراموش کر رکھا ہے۔ مراحل زندگی میں اس کو آگے رکھنے کے بجائے پیٹھ پیچھے رکھ چھوڑا ہے "اور کچھ اقرار اور کچھ انکار" کی روش پر پورے اطمینان کے ساتھ چلے جا رہے ہیں اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ قدرت أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ کا الزام ایک محدود معنی ہی میں سہی ان پر عائد نہ کرے اور پھر خزی فی الحیاۃ الدنیا کی اس پاداش کا انہیں مستحق نہ ٹھیرائے جس کا اس کا قانون مطالبہ کرتا ہے۔

تیسرا باب

چہ باید کرد؟

فرض کی پکار

اگر ہم یہ پسند نہیں کرتے کہ ہماری موجود حالت جوں کی توں برقرار رہے' اور ہم پر خود اپنے وجود سے دشمنی کرنے کا ایک فرض ناشناس گروہ ہونے کا جو واقعی الزام لگ چکا ہے وہ نہ خلق کے سامنے سے دور ہو نہ خدا کے سامنے سے۔ تو اس کی واحد تدبیر صرف یہی ہو سکتی ہے کہ ہم خود شناس نہیں' اپنا فرض یاد کریں اور پھر اسی نصب العین کے ہو رہیں۔ جس کے سوا ہمارا کوئی دوسرا نصب العین نہیں اور نہ مسلمان ہوتے ہوئے کبھی ہو سکتا ہے۔ یہ بات نہ کسی خوش عقیدگی کی پیداوار ہے نہ ماضی پرستی کا نتیجہ' بلکہ یہ اس کتاب کا فیصلہ ہے جسے ہم انسانی کلام نہیں بلکہ الٰہی کلام مانتے ہیں۔ جس کو سچی ہدایت اور یقینی علوم کا سرچشمہ قرار دیتے ہیں اور جس کی ہر بات کو بلا چون و چرا تسلیم کرنے کا ہم نے عہد کیا ہے جس وقت یہ کتاب نازل ہو رہی تھی اس وقت پچھلی آسمانی کتابوں کے پیرو (یہود و نصاریٰ) کچھ اسی قسم کے حالات سے دوچار تھے۔ جب اس نے ان کی اعتقادی گمراہیوں اور عملی خرابیوں پر تنقید کی اور ان کے برے انجام سے انہیں ڈرایا اور اللہ کا سچا دین پیش کر کے اس کے اتباع کی انہیں دعوت دی تو ان کی رگوں میں الٹی جاہلی حمیت کی آگ بھڑک اٹھی۔ کیونکہ انہیں غصہ تھا کہ ہم خود آسمانی مذہب رکھنے والے ہیں۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے لاڈلے ہیں۔ اس لیے انہیں گوارا نہ ہو سکا کہ کوئی اور ان کے

سامنے ہدایت اور امامت کا علم بردار بن کر آئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جواب میں وہ جارحانہ حملوں پر اتر آئے' اور ایک طرف اسلام کی تردید و تکذیب پر' دوسری طرف اپنی عظمت و امامت پر زور بیان صرف کرنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی ان کٹھ حجتیوں کے اور ان کے اس ادعا کے جواب میں فرمایا:

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَسْتُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ حَتَّىٰ تُقِيمُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ (مائدہ - ۶۸)

اے پیغمبر ان لوگوں سے کہہ دو کہ اے اہل کتاب! تم ہرگز اصل پر نہیں ہو جب تک کہ تم قائم نہ کرلو توراۃ اور انجیل کو' اور اس چیز کو جو تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف اتری ہے۔

یعنی تم اپنی موجودہ حالت میں رہتے ہوئے ہرگز اس امر کے مستحق نہیں ہو کہ دلیل و برہان کے ہتھیار سے حق کے بارے میں کلام کرسکو۔ تم نے وہ بنیاد ہی کھود کر پھینک رکھی ہے جس پر تمہارے وجود ملی کی عمارت کھڑی تھی۔ اس معاملہ میں تم بحث و جدال کے حقدار اسی وقت ہو سکتے ہو' جب تم ان ہدایات پر کاربند ہو جاؤ' اور اپنی زندگیوں کو ان تمام احکام کا پابند بنا دو جو سلطان حقیقی کی جانب سے تم پر مختلف وقتوں میں نازل ہوتے رہے ہیں۔ تم نے کتاب الٰہی کے جن حصوں کو اپنی دنیائے عمل سے خارج کر رکھا ہے ان کو ازسرنو نافذ کرلو۔ جن صداقتوں کا تمہیں علم دیا گیا تھا ان کی حفاظت اور برملا اشاعت کا بھولا ہوا فریضہ یاد کرلو۔ اور تمہاری زندگی کا جو مقصد ٹھیرایا گیا تھا۔ اسے پھر اپنالو۔

اب غور کیجئے اسی فیصلہ قرآنی کی روشنی میں خود اپنے معاملہ پر امت مسلمہ کے اتباع کی عملی حالت بھی جب یہی ہے کہ کتاب الٰہی کا ایک حصہ صرف برکت تلاوت کے لیے رہ گیا ہے اور اس سے اس کا کوئی تعلق باقی نہیں رہا ہے تو انصاف کیا کہتا ہے؟ کیا اس کے سوا کچھ اور کہ اسے بھی لستم علی شیء کا سزا وار ٹھیرایا جائے؟ اور جب تک وہ "قرآن کی اقامت" نہ کرے اس وقت تک اسے شھدآء

حق اور خیر امتہ ہونے کے اعزاز کا حقدار نہ سمجھا جائے؟ یقیناً" نہیں' اور بلاشبہ یہ اس کی ایک طرح کی دھاندلی ہوگی۔ اگر وہ اس اعزاز کے تمغے کو اس حالت میں بھی اپنے سینے پر آویزاں کئے رہے۔ اس لیے اگر وہ اپنے فرض کا بارگراں پھر سے اپنے کاندھوں پر اٹھا لے' اور دنیا کے ہر کام' ہر ہنگامے' ہر مشغولیت اور ہر دلچسپی سے منہ موڑ کر اپنی نظریں اسی ایک کام پر جما لے۔ یہ اس کے منصب اور اس کے مقصد وجود کا مطالبہ ہے۔ اس کے ملی تشخص کی بحالی کی اس کے سوا کوئی تدبیر ہی نہیں کہ وہ اس مطالبے کے آگے سر جھکا دے۔

ملی نجات کی شاہراہ

اسی طرح اس امت کے لیے دنیوی عزت و اقبال کی بازیافت کی راہ بھی اس کے سوا کوئی دوسری نہیں' جس کا ناقابل انکار ثبوت قرآن مجید کا وہ ارشاد ہے جو اس نے ذلت و مسکنت کے مارے ہوئے بنی اسرائیل کے بارے میں فرمایا تھا۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَ دْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ (مائدہ ۶۵'۶۶)

اگر یہ اہل کتاب ایمان رکھتے اور خدا ترسی کی راہ چلتے تو ہم ان کی برائیاں ان سے دور کر دیتے اور نعمت کے باغوں میں انہیں داخل کرتے' اور اگر وہ توراۃ اور انجیل کو اور ان ہدایتوں کو جو ان کے رب کی طرف سے انہیں پہنچی ہیں قائم کرتے تو اپنے اوپر سے بھی رزق بٹورتے اور اپنے قدموں کے نیچے سے بھی۔

یہ تھی وہ تدبیر جس کے ذریعے امت اسرائیل کو اس کا کھویا ہوا اقبال واپس مل سکتا تھا۔ اس ارشاد قرآنی کی روشنی میں امت مسلمہ کا معاملہ بھی کچھ مشکل نہیں رہ جاتا' مرض کی یکسانی چاہتی ہے کہ علاج بھی ایک ہی ہو۔ ہلاکت و نامرادی جس راہ سے

اہل کتاب کے یہاں آئی تھی۔ آپ دیکھ چکے ہیں کہ اہل قرآن کے پاس بھی اسی راہ سے آئی ہے' اس لیے کھلی بات ہے کہ اس سے نجات بھی اسی طریقے سے مل سکتی تھی۔ جس کی اہل کتاب کو تلقین کی گئی تھی۔ قرآن کہتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اسی کا کہنا ایک مومن کے لیے حرف آخر کا حکم رکھتا ہے کہ اہل کتاب نے خداوندی احکام و ہدایات کے کچھ حصوں کو چھوڑ دیا اور بھلا رکھا تھا۔ جس کے نتیجے میں رحمت الٰہی ان سے روٹھ گئی۔ اور غضب خداوندی ان پر ٹوٹ پڑا۔ جس سے نجات کی واحد تدبیر صرف یہ تھی کہ ان احکام و ہدایات پر وہ پھر سے عمل کرنے لگتے۔ اب اگر کسی کے دل و دماغ قرآن حکیم کی "زبان" سمجھنے کی صلاحیتوں سے بالکل محروم نہیں ہو چکے ہیں تو اس کے لیے اس پیغام کا سمجھ لینا ذرا بھی دشوار نہیں جس کی طرف وہ اپنے اس ارشاد میں صاف طور سے انگلی اٹھا کر اشارہ کر رہا ہے۔ چنانچہ جس کسی کو اللہ تعالیٰ نے ہوشمندی اور عبرت کے کان دیئے ہیں۔ وہ قرآن کے انہی لفظوں میں سے یہ آواز بھی سن سکتا ہے کہ:

"اگر قرآن کے پیرو ایمان رکھتے اور خدا ترسی کی راہ چلتے تو ہم ان کی برائیاں ان سے دور کر دیتے اور نعمت کے باغوں میں انہیں داخل کرتے اور اگر وہ قرآن کو قائم کرتے تو اپنے اوپر سے بھی رزق بٹورتے اور اپنے قدموں کے نیچے بھی۔"

نیز یہ کہ:

"اے اہل قرآن! تم ہرگز کسی اصل پر نہیں جب تک کہ قرآن کو قائم نہ کرو"۔

غرض "اقامت قرآن" دوسرے لفظوں میں اقامت دین ہی وہ واحد نسخہ شفا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لئے پہلے ہی تجویز فرما دیا تھا اور یہ بتا دیا تھا کہ یہی وہ چیز ہے جس پر تمہاری اخروی سعادت کا بھی انحصار ہے اور تمہاری دنیوی فلاح کا بھی' تم کو جب بھی ان چیزوں کی تلاش ہو' اس کے لئے راستہ یہی اختیار کرنا' باقی ہر طرف سراب ہی سراب ہو گا جہاں ٹھوکریں کھانے کے سوا تمہارے کچھ ہاتھ نہ لگ سکے گا۔ یعنی قرآن ہمیں پھر اسی مقام پر واپس جانے کا حکم دے رہا ہے جہاں سے ہم

ہٹ آئے ہیں حضرت امام مالکؒ نے یہ پیش گوئی نہیں کی تھی کہ نہ اپنے کسی کشف کا اظہار کیا تھا جب فرمایا تھا کہ:

لن یصلح اخر ھذہ الامۃ الا بما صلح بہ اولھا

یہ امت اپنے آخری دور میں بھی بہرحال اسی چیز سے خیر و اصلاح پا سکے گی جس سے اس نے اپنے ابتدائی دور میں پائی تھی۔

بلکہ یہ ایک روشن حقیقت تھی جس کا ان کی مومنانہ بصیرت نے پورے تیقن سے ادراک کیا اور جس کے سوا کسی صاحب ایمان کے ذہن میں کوئی دوسری بات آ ہی نہیں سکتی۔ جہاں تک "صلاح دین" کا تعلق ہے اس کے لئے اتباع دین کے سوا اور کوئی ذریعہ تصور ہی میں نہیں آ سکتا۔ کھلی بات ہے کہ دینی سدھار دین ہی کے اپنانے سے ہو سکتا ہے رہ گئی امت کی "دنیوی صلاح" تو یہ بھی اس کے شہادت حق کے منصب پر فائز جماعت ہونے کے باعث اسی دین سے وابستہ ہے۔ کیونکہ اسے جو عروج و اقبال بھی بخشا گیا تھا وہ سب اسی نصب العین سے وفاداری کا صلہ تھا اور اس سے اللہ تعالیٰ نے فتح و نصرت کے جتنے وعدے کئے تھے وہ سب اسی اقامت دین کی شرط سے مشروط تھے چنانچہ جب مسلمانوں کو یہ بشارت دی گئی کہ تم ہی سربلند ہو گے اور تمہارے مقابلے میں تمہارے دشمنوں کا انجام محکومیت ہو گا (انتم الاعلون) تو اسی کے ساتھ (ان کنتم مومنین) کی بھی شرط لگادی گئی تھی۔ ظاہر ہے یہ مشروط وعدہ کوئی وقتی اور خصوصی وعدہ نہیں تھا بلکہ ایک ابدی اور اصولی وعدہ تھا۔ احادیث سے تو یہاں تک معلوم ہے کہ خود اس امت کے اندر بھی خاص طور پر وہی گروہ اس کے اعزاز و اقبال کا نمائندہ اور علم بردار ہو گا جو اقامت دین کے فریضے کو پورا کر رہا ہو گا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

اِنَّ ھٰذَا الْاَمْرَ فِی قُرَیْشٍ لَا یُعَادِیْھِمْ اَحَدٌ اِلَّا کَبَّہُ اللّٰہُ عَلٰی وَجْھِہٖ مَا اَقَامُوا الدِّیْنَ (بخاری بحوالہ مشکوٰۃ)

بلاشبہ یہ خلافت اس وقت تک قریش میں رہے گی جب تک وہ دین کو قائم رکھنے

کا فریضہ ادا کرتے رہیں کے جو کوئی بھی ان سے عداوت کرے گا اللہ اس کو اوندھا گرا دے گا۔

پچھلی بحثوں کا خلاصہ

اب تک کی تمام بحثوں سے چند اصولی نکتے نکھر کر سامنے آجاتے ہیں:
ایک یہ کہ اس امت کا مقصد وجود اور نصب العین اللہ کے دین کی اقامت تھا اور ہے۔

دوسرا یہ کہ اس فریضے کو انجام دینے میں اللہ تعالیٰ کی غیبی اعانتیں اس کے شامل حال رہتی ہیں اور دراصل یہی غیبی اعانتیں تھیں جن کے طفیل وہ مثالی عزت و اقبال سے سرفراز ہوئی تھی۔

تیسرا یہ کہ اس امت کے عروج و زوال کا اصل انحصار طبعی قوانین اور مادی اسباب و تدابیر پر نہیں ہے بلکہ اخلاقی قانون پر ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اس کا عروج اپنے اس فریضے کے بجالانے پر موقوف ہے جس کے لئے وہ مبعوث کی گئی ہے اور موقوف بھی اس طرح کہ اگر اس نے اس فرض سے پہلو تہی کی تو دوسری قوموں کی بہ نسبت وہ اللہ تعالیٰ کے دربار سے دوگنی سزا کی مستحق ہو گی۔

چوتھا یہ کہ اس امت کے موجودہ حالات اس بات پر صاف دلالت کرتے ہیں کہ اس نے کتاب اللہ کے ایک بڑے حصے کو عملاً چھوڑ رکھا ہے اور اقامت دین کے فریضے سے غافل ہو گئی ہے۔

پانچواں یہ کہ قرآنی فیصلے کی رو سے اس امت کے لئے فلاح و نجات کا راستہ ہر طرف سے بند ہے ماسوا اس ایک راستے کے کہ وہ اپنے فریضہ حیات کو پہچان لے اور اللہ کے دین کو از سرنو قائم کر دینے میں تن من دھن سے لگ جائے۔ ورنہ اگر اس نے اس راہ کے سوا کوئی اور راہ اختیار کرنے کی کوشش کی تو اس کی تمام تدبیریں اور کوششیں نہ صرف یہ کہ ضائع جائیں گی، بلکہ وہ اسے اس کے اپنے مقام سے اور دور

پھینک دیں گی۔ اور رہا سہا ملی وقار و اقبال بھی چھین لیں گی۔ وہ دوسری قوموں کے مقابلے میں دین کا سر رشتہ چھوڑ کر کبھی آگے نہیں بڑھ سکتی اور اگر بظاہر کوئی سربلندی اس کو مل بھی گئی تو وہ غیروں کا عطیہ ہو گی جس کا وجود بھی غیروں کے رحم و کرم پر ہو گا اور یہ بجائے خود ایک بڑی ذلت ہے۔

گریز کی راہیں

خواہش فرار کا دباؤ

ان حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے ایک ایسے شخص کے لئے جو اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان رکھتا ہو، جو مسلمان ہی مرنا چاہتا ہو اور جس کو کل قیامت کے دن اپنے فریضہ حیات کی بابت جواب دہی کا پورا احساس ہو۔ نیز جسے اس بات کا یقین ہو کہ کلام الٰہی جو کچھ فرماتا ہے، عروج و زوال اور عزت و دولت کے جو فلسفے بتاتا ہے وہ انسانی عقل کے گھڑے ہوئے فلسفوں کی طرح گمان اور قیاس پر مبنی نہیں ہیں۔ بلکہ اس کی بنیاد حقیقت نفس الامری پر رکھی گئی ہے، وہ حق ہے سراپا حق ہے، ایسے شخص کے لئے اس کے سوا اور کوئی راہ قابل اختیار رہ ہی نہیں جاتی کہ ہر طرف سے اپنی آنکھیں پھیر کر ہر آواز کے لئے اپنے کان بند کرکے نفس کے ہر فریب اور شیطان کے ہر وسوسے سے دل کو پاک کرکے اور تمام اندیشوں سے بے پروا ہو کر صراط مستقیم پر اپنے قدم مضبوطی سے جمالے اور اپنے جسم و دماغ کی ساری قوتیں دین حق کے قائم کر دینے میں لگا دے، وہ اپنے فہم و تدبر سے کام لے کر اس کے لئے مناسب وقت تدبیریں سوچ سکتا ہے، حالات زمانہ کے لحاظ سے ایک خاص طریقہ عمل اختیار کر سکتا ہے۔ ماحول کے تقاضے سے کوئی مخصوص پالیسی مرتب کر سکتا ہے لیکن یہ ہرگز نہیں کر سکتا کہ اپنے نصب العین اور مقصد حیات ہی میں کوئی ترمیم کر لے۔ یا اس کو ملتوی کر دے یقیناً" اس طرح کی کوئی بھی کاروائی اس کے اختیار سے باہر ہے وہ اس راہ سے

ہٹ کر اور اس نصب العین کو چھوڑ کر جو قدم بھی اٹھائے گا وہ اللہ اوراس کے رسول سے بغاوت کا' اور ملی خودکشی کا قدم ہو گا۔ اس وقت اس کی مثال اس نادان اندھے کی سی ہو گی جو کسی گہرے کھڈ کی طرف بڑھ رہا ہو اور اس کا بہی خواہ رہنما چلا چلا کر اسے اُدھر جانے سے منع کر رہا اور صحیح راہ پر لانے کی کوشش کر رہا ہو۔ مگر وہ ہے کہ ایک طرف تو وہ اپنے اس رہنما کی با خبری' راست گوئی' اس کی خیر خواہی اور اس کے خلوص کا قصیدہ پڑھ رہا ہو اور دوسری طرف اسی سمت بڑھے جانے پر محض اس لئے اصرار بھی کر رہا ہو کہ اس سمت کی زمین اسے کچھ ڈھلوان معلوم ہو رہی ہے۔ جس پر قدم آسانی کے ساتھ پڑتے جا رہے ہیں اور اس کی مخالف سمت کی زمین کچھ بلند دکھائی دیتی ہے جس پر قدم رکھنے میں چڑھائی کی دقتیں اٹھانی پڑتی ہیں۔

لیکن بدقسمتی سے بحیثیت مجموعی آج یہ امت بالکل اسی اندھے کا پارٹ ادا کر رہی ہے وہ ہر اس سمت دوڑ پڑنے کے لئے تیار ہے جس پر کسی قوم کو سرگرم سفر دیکھ پائے۔ بشرطیکہ یہ راہ اسے سہل اور ہموار اور دل کش دکھائی دیتی ہو چاہے وہ ٹھیک ہلاکت و نامرادی کی جہنم ہی تک کیوں نہ لے جاتی ہو۔ اگر کسی سمت اس کے قدم اٹھنے سے انکار کرتے ہیں تو وہ وہی سمت ہے جو اقامت دین کی سمت کہلاتی ہے' اور یہ صرف اس لئے کہ یہ راہ اس کو مشکلات کے کانٹوں سے بھری ہوئی دکھائی پڑتی ہے۔ قرآن اس کو دوسری تمام راہوں سے روک کر اسی راہ کی طرف بلاتا ہے۔ مگر وہ سنی ان سنی کر دیتی ہے وہ کہتا ہے کہ میں ہی تیرا بہی خواہ ہوں وہ جواب دیتی ہے کہ یہی ہمارا ایمان ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں ہی تیرا ہادی اور نجات دہندہ ہوں وہ جواب دیتی ہے کہ اس سے کس کافر کو انکار ہے؟ وہ کہتا ہے میں کبھی جھوٹ نہیں بولتا' کبھی غلط بات نہیں کہتا' کبھی اپنے دعووں کی بنیاد وہم و گمان اور اٹکل پچو پر نہیں رکھتا' وہ جواب دیتی ہے کہ لاریب' وہ قرآن کہتا ہے میرے پاس اور صرف میرے پاس علم حقیقت ہے میں ہمیشہ صحیح راہ بتاتا ہوں'تمہاری اور ساری انسانیت کی نجات کا راز صرف میری تعلیمات میں مضمر ہے۔ وہ جواب دیتی ہے کہ "بلاشبہ" وہ کہتا ہے کہ جو کچھ میرے سوا ہے باطل ہے' جو کچھ میرے خلاف ہے سراسر جہل ہے۔ جو کچھ مجھ سے ہم

آہنگ نہیں' اس میں تباہی و بامرادی کے علاوہ کچھ نہیں۔ وہ جواب دیتی ہے کہ یقیناً" لیکن جب وہ یہ کہتا ہے کہ تیرے لئے میرے پاس صرف ایک وصیت ہے" اقامت دین کی وصیت تو اس کی زبان جو اب تک اس کے ہر دعوے کی تصدیق میں اتنی تیز تھی' معاً" بند ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ ان کا نفس حیلوں اور تاویلوں کا لشکر تیار کر کے سامنے آجاتا ہے تاکہ اس اضطراب کو کچل ڈالے' جو اس منافقانہ خاموشی کے باعث اس کی روح کی گہرائیوں میں رونما ہوتا ہے مجرم انسان اگر اس کے اندر غیرت اور عزت نفس کی کوئی رمق باقی ہو' لوگوں کے سامنے مجرم کی حیثیت سے آنا کبھی گوارا نہیں کرتا اگر اس غیرت اور عزت نفس کی حس میں احساس فرض کی حرارت بھی موجود ہوتی ہے تو وہ اسے مجبور کر دیتی ہے کہ اپنے جرم کا کفارہ ادا کرے اور اپنے عمل کے ذریعے اپنے دامن سے اس داغ کو دھو ڈالے اور اگر یہ صورت حال نہیں ہوتی اور اس کا سینہ اس حس اور اس احساس سے خالی ظاہر ہوتا ہے تو پھر اس کی تمام دماغی قابلیتیں اس بات پر صرف ہونے لگتی ہیں کہ کسی طرح اس جرم کو عین حق و صواب ثابت کر دے اس وقت اس کا نفس اسے بے گناہی کا فریب دینے میں ہمہ تن مشغول ہو جاتا ہے اور اس کے حکم سے اس کا دماغ تاویلوں کی ایک خوشنما نقاب تیار کر دیتا ہے جس کو وہ اپنے چہرے پر ڈال کر اپنے آپ کو یہ محسوس کرا لیتا ہے کہ میں بر سر غلط قطعاً" نہیں ہوں اس کے بعد اس کی خواہش اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ دوسروں کو بھی ایسا ہی محسوس کرا دے تاکہ اس کے داغ گناہ کی طرف کوئی انگلی اٹھانے والا نہ رہ جائے۔ ٹھیک یہی حال ہے اپنے فریضہ ملی اور مقصد زندگی کی بجا آوری میں امت مسلمہ کا۔ وہ اپنے فرض کو چھوڑ بیٹھنے پر کچھ اسی قسم کے ادعائے بے گناہی کا مظاہرہ کر رہی ہے صدیوں کے انحطاط اور زوال نے اس کے احساس فرض کو بری طرح کچل کر رکھ دیا ہے اور ان بلند جذبات سے اس کا سینہ تقریباً" اجڑ گیا ہے جو کسی نصب العین کی بجا آوری کے لئے ضروری ہوا کرتے ہیں۔ خصوصاً" اقامت دین کے نصب العین کے لئے جو کبھی بھی آسان نہ تھا اور جس میں جان و مال کی بازی' عیش و آرام کی قربانی اور امیدوں اور تمناؤں کی پامالی شرط اول قدم ہے اس لئے بجائے اس کے کہ وہ اپنے جرم کو تسلیم کر کے تلافی کی کوشش کرتی اور اپنے نصب

العین کو سنبھال لیتی' سرے سے اپنی کوئی ذمہ داری ہی نہیں تسلیم کرنا چاہتی۔ بلکہ طرح طرح کی دور ازکار تاویلوں سے اپنے رہے سہے احساس کو بھی دباتی جا رہی ہے۔ یہ تاویلیں مختلف قسم کی ہوتی ہیں اور مختلف لوگ ادائے فرض کے مطالبے پر جواب میں مختلف معذرتیں پیش کرتے ہیں۔ چونکہ یہی تاویلیں اور یہی معذرتیں دوسرے لفظوں میں فرار اور گریز کے یہی "فلسفے" امت کے ۹۹ فیصد سے زیادہ افراد کے لئے حجاب نظر بنے ہوئے ہیں اور جب تک ان کی بے حقیقتی واضح نہیں کر دی جاتی کہ ان کا اپنے فرض کی طرف پلٹ آنا محال سا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ان کا جائزہ لیا جائے اور پھر ان پر تنقید کر کے بتا دیا جائے کہ فی الواقع ان کی کیا قدر و قیمت ہے؟

گریز کے "فلسفے"

جہاں تک عام جائزے کا تعلق ہے یہ تاویلیں یا گریز کے یہ "فلسفے" پانچ ہیں :-

ایک گروہ کا کہنا یہ ہے کہ عمل کرنے ر ے کے لیے کسی حال میں بھی اپنی واقعی ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہوجانے کی راہ بند نہیں۔ چنانچہ جن کو اللہ تعالیٰ نے حسن عمل اور خشیت و انابت کی توفیق بخشی ہے وہ آج بھی دنیا پر ٹھیک ٹھیک عامل ہیں۔ اپنے فریضے کو انجام دے رہے ہیں۔ اور امر بالمعروف کرتے رہتے ہیں۔ رہ گئے قرآن و سنت کے اس طرح کے اجتماعی احکام' جن کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے تو ان کا تعلق اسلامی حکومت سے ہے۔ دین کی اقامت کر رہے ہیں' حق کی شہادت دے رہے ہیں اور اس کے مخاطب مسلمانوں کے اولوالامر ہیں۔ عوام نہیں ہیں۔ اس وقت چونکہ اسلامی حکومت قائم نہیں ہے اس لیے ان احکام کے اجراء و نفاذ کی ذمے داریوں کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اور اگر کچھ احکام ایسے ہیں بھی جن کا تعلق براہ راست عام افراد سے ہے لیکن جن پر عمل نہیں ہو رہا ہے مثلاً" غیر اسلامی عدالتوں سے معاملات کا فیصلہ نہ کرانا اور غیر اسلامی قوانین کے مطابق فیصلے نہ کرنا وغیرہ' تو ایسا وہ اضطراراً"

کر رہے ہیں۔ اور یہ شریعت کا ایک عام اصول ہے کہ اضطرار کے وقت ناجائز کام بھی مباح ہو جاتے ہیں۔ اس لیے قرآن کے ایک حصے کو چھوڑ بیٹھنے اور اقامت دین کا فریضہ بھول جانے کا عمومی الزام صحیح نہیں ہے۔

دوسرا اگر وہ کہتا ہے کہ بلا شبہ ملت اسلامیہ کا مقصد وجود یہی اقامت دین ہی ہے لیکن موجودہ ناسازگار حالات میں اس نصب العین کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں ہے لہٰذا اس وقت اس کی خاطر جدو جہد کرنا وقت اور قوت کو ضائع کرنا ہے اور دنیا کے سامنے اسے علانیہ پیش کرنا صرف مصلحت کے خلاف اور ناقبت اندیشی کی دلیل ہی نہیں ہے بلکہ مفاد ملت کے لیے سراسر مضر اور مہلک بھی ہے۔ اس لیے سردست خدمت دین کی کچھ ایسی جزئی تدبیریں اختیار کی جانی چاہئیں جو ممکن العمل ہوں اور تجربے سے دین کے احیاء میں مفید ثابت ہو چکی ہوں اور جو آگے چل کر ہمارے اس نصب العین کے لیے حالات کو نسبتاً کچھ زیادہ سازگار بنا دینے والی ہوں۔ پھر جب یہ آج کے حالات بدل جائیں گے اور ہمارے اس مشن کے لیے وہ اتنے ناسازگار نہ رہ جائیں گے جتنے کہ اب ہیں' اس وت اس کے لیے براہ راست جدوجہد شروع کی جائے گی۔

تیسرے گروہ کا انداز فکر یہ ہے کہ اس نصب العین کے برحق ہونے میں کوئی کلام نہیں' مگر اس کے لیے صدیق اور فاروق درکار ہیں' اور ہم ایسے بن نہیں سکتے' اس لیے ہمارے بس کا یہ کام ہی نہیں ہے۔ جس مشن کو پیغمبرؐ کی تربیت یافتہ جماعت بھی تیس برس سے زیادہ نہ چلا سکی۔ اس کے لیے ہم جیسے ضعیف الایمانوں کا دم خم دکھانا تقدیر سے لڑنا ہے اب وہ زمانہ نہیں آسکتا جو تیرہ سو برس پہلے گزر چکا۔

چوتھا گروہ یوں سوچتا ہے کہ کام کی کوئی راہ کھلے اور کوئی قافلہ اس پر کامیاب گامزنی کا مظاہر کرے تو ہم بھی اٹھ کر کھڑے ہوں گے۔ گویا کسی جدوجہد کا شروع ہو جانا بھی ان کے لیے اقدام کو ضروری نہیں ٹھیرا سکتا' بلکہ یہ اقدام ان کے لیے صرف اس وقت ضروری ہوگا' جب کہ کچھ لوگ آگے چلنے والے انہیں نظر آجائیں اور وہ

مضبوطی اور ثابت قدمی دکھا کر ایک حد تک راستے کو صاف بھی کردیں' جب تک ایسا نہیں ہو جاتا اس کے لیے اس جدوجہد میں شریک ہو جانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی ہے جو حضرت امام مہدی کے آنے کے منتظر بیٹھے ہیں اس گروہ کو اگرچہ اس نصب العین کے برحق ہونے سے اختلاف نہیں۔ مگر اس کے سوچنے کا انداز کچھ اس طرح کا ہے کہ اس کام کے لئے اللہ تعالٰی نے امام مہدی کے بھیجنے کا وعدہ فرمایا ہے اور انہیں کی زیر سرکردگی یہ مہم چلائی جائے گی۔ ان کی آمد سے پہلے اس کام کی عام امت پر کوئی خاص ذمے داری ہے ہی نہیں۔ اس لئے ہم خواہ مخواہ یہ درد سر نہیں خریدنا چاہتے۔

یہ سارے گروہ اور ان کے خیالات مسلمانوں کے ان حلقوں سے تعلق رکھتے ہیں جو مذہبی اور دیندار حلقے کہے جاتے ہیں۔ رہ گئے وہ لوگ جو دین کے قلاوے کو اپنی گردن سے عملاً" اتار کر پھینک چکے ہیں اور جو اپنے مسائل زندگی میں قرآن و سنت کو اتھارٹی تسلیم کرنے کے لئے تیار ہی نہیں۔ تو ان کے خیالات سے تعرض کرنا فضول ہے کیونکہ وہ اس بات کے حق دار ہی نہیں کہ اس بحث میں ان کی باتوں کو بھی کوئی جگہ دی جائے بلکہ وہ شاید خود بھی اسے پسند نہ کریں۔

اب آیئے ترتیب وار ہر گروہ کے خیالات کو دلائل کی میزان میں تول کر دیکھیں تاکہ ان کا صحیح وزن معلوم ہو سکے اور یہ بات کھل کر سامنے آجائے کہ آیا ان تاویلوں میں سے کوئی ایک تاویل بھی ایسی ہے جس سے واقعتاً" ہماری ذمے داری اور مسئولیت کچھ ہلکی ہو جاتی ہو۔

۱۔ دین کے جزوی اتباع پر اطمینان

پورے مجموعہ شریعت کی پیروی کا جواب

اس امر کا دعویٰ تو کوئی بھی نہیں کر سکتا کہ قرآن و سنت میں صرف نماز' روزے اور حج و زکوٰۃ ہی کے فرائض کا ذکر ہے اور مومن سے صرف انہی احکام کی بجا آوری کا مطالبہ کیا گیا ہے' اسی طرح یہ کہنے کی بھی کوئی جسارت نہیں کر سکتا کہ عبادات اور اخلاق کے ماسوا جو احکام ہیں وہ (نعوذ باللہ) محض بھرتی کے مضامین کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بخلاف اس کے یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ کتاب و سنت میں جو احکام ہیں وہ بندگی کا ایک جامع نظام اور زندگی کا ایک جامع ضابطہ ہیں اور ان کا ایک ایک جزو اتباع اور عمل ہی کے لئے ہے' آپ ان میں علمی طور پر جو فرق مراتب چاہیں کر لیں اور ان کے اجر و ثواب میں بھی باہم جو نسبت چاہیں متعین کر لیں۔ لیکن عملی طور پر کسی تفریق کے نہ آپ حقدار ہیں اور نہ اس کی کوئی ضرورت ہے۔ ایک غلام کا فرض اپنے آقا کے ہر چھوٹے بڑے حکم کی تعمیل ہے۔ اس کو یہ حق کبھی نہیں پہنچتا کہ ضروری اور غیر ضروری کی بحثیں پیدا کر کے بعض حکموں کو تو مانے اور بعض سے بے رخی برت جائے۔ آقا کا حکم بہر حال حکم ہے' جسے ہر صورت میں پورا ہونا چاہئے۔ مسلمان نے بھی اللہ تعالیٰ کی کامل بندگی اور ہمہ وقتی غلامی کا عہد کیا ہے۔ اب اگر (بطور مثال) اس آقا کی طرف سے اس کے پاس دو حکم آتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ نماز پڑھو۔ دوسرا یہ کہ چور کا ہاتھ کاٹ دو۔ تو اس کا فرض ہے کہ وہ یکساں توجہ کے ساتھ ان دونوں حکموں پر عمل کرے اس لئے کہ وہ ان میں سے پہلے حکم پر عمل کرتا ہے اور دوسرے کو سن کر خاموش ہو رہتا ہے۔ تو کون ہے جو اس کے اس طرز عمل کو اللہ تعالیٰ کی کامل اطاعت اور اس کی کتاب الاحکام .... قرآن .... کی پوری پابندی قرار دے سکے پھر یہ کیا ستم ہے کہ قرآن کے ایک دو نہیں بیسیوں احکام معطل ہو کر رہ گئے ہیں اور پھر بھی ہمیں خوش فہمی ہے کہ ہم اتباع دین کے مطالبے سے پوری طرح عہدہ بر آ ہو رہے

ہیں؟

سیاسی اقتدار سے محرومی کا عذر

رہا یہ عذر کہ ہم تو ان احکام کے سرے سے مکلف اور مخاطب ہی نہیں' ان کے نفاذ کی ذمے داری تو مسلمانوں کے اولوالامر پر ہے۔ آج چونکہ اسلامی حکومت موجود نہیں اس لئے ان احکام کے نافذ کرنے کا سوال ہی باقی نہیں رہ گیا ہے اور اس وقت یہ ذمے داری ہی ساقط ہے .... تو یہ کھلا ہوا عذر گناہ ہے اور ایسا عذر گناہ جو خود اس گناہ سے بھی بدتر ہے۔ قرآن میں کہیں بھی یہ نہیں کہا گیا ہے کہ اے مسلمانوں کے اولوالامر! تم چور کا ہاتھ کاٹ دو یا یہ کہ اے اسلامی حکومت کے ذمے دارو! تم زانی کو کوڑے مارو۔ بلکہ اس طرح کے قوانین کا اور ان کے نفاذ کا جب وہ حکم دیتا ہے تو مخاطب پوری امت کو بناتا ہے مثلاً" آیت سرقہ ہی کو لے لیجئے' جس کے الفاظ یہ ہیں:

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَۃُ فَاقْطَعُوْا اَیْدِیَھُمَا (مائدہ - ۴)

چور مرد اور چور عورت کے ہاتھ کاٹ دو۔

ان لفظوں کے اندر اگرچہ یہ صراحت نہیں ہے کہ خطاب اس حکم کا کن سے ہے؟ مگر دو وجوہ یہاں ایسے ہیں جن کے باعث بنیادی طور پر اس حکم کا مخاطب اہل ایمان کا پورا گروہ ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ ایک تو یہ اصول کہ جب تک کسی حکم کے بارے میں یہ صراحت نہ ہو یا کوئی زبردست قرینہ نہ موجود ہو کہ یہ حکم فلاں خاص شخص یا خاص گروہ کے لئے ہے' اس وقت تک اس کو سارے اہل ایمان کے لئے عام سمجھا جائے گا دوسری وجہ یہ کہ اس آیت سے تین آیتیں پہلے جو کچھ فرمایا گیا ہے اسے یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْ الخ کہہ کر' یعنی تمام اہل ایمان کو خطاب کرکے فرمایا گیا ہے درمیان کی دو آیتوں میں کفار کے انجام بد کا ذکر ہے اور اس کے بعد ہی یہ آیت سرقہ ارشاد ہوئی ہے۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْ کے خطاب

سے جو کچھ یہاں بیان فرمایا گیا ہے' ہاتھ کاٹنے کا یہ حکم بھی اسی کے اندر شامل ہے اور اس کا مخاطب نہ کوئی خاص فرد ہے نہ مسلمانوں کا کوئی خاص گروہ' بلکہ سارے مسلمان ہیں چنانچہ علامہ ابن جریر طبریؒ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

يقول جل ثناءه من سرق من رجل او امراة فاقطعوا ايها الناس يده............ فلا تفرطوا ايها المومنون فى اقامته حكمى على السراق و غيرهم من اہل الجرائم الذين او جبت عليهم حدودا فى الدنيا

اللہ عزوجل فرماتا ہے کہ اے لوگو! جو مرد یا عورت چوری کرے اس کے ہاتھ کاٹ دو .... اے مسلمانو! چوروں اور ان تمام مجرموں پر' جن کے لئے میں نے دنیا میں سزائیں مقرر کر دی ہیں۔ میرے احکام جاری کرنے میں ذرا بھی کوتاہی نہ کرنا۔ (تفسیر ابن جریر جلد ۶' صفحہ ۱۳۳)

غور سے دیکھئے ایک جگہ "فاقطعوا" کے مخاطب حقیقی کی تصریح علامہ نے "أَيُّهَا النَّاس" کے لفظ سے کی ہے اور دوسری جگہ "ایھا المومنین" کے لفظ سے "یااولی الامر" کہیں نہیں فرمایا۔ یہی نہیں بلکہ ساتھ ہی یہ بات بھی واضح کر دی کہ مخاطبت کا یہ عموم صرف اسی آیت سرقہ تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ تمام کے تمام تعزیراتی احکام کا حال یہی ہے اور ان سب میں بنیادی خطاب سارے اہل ایمان کی طرف ہوتا ہے دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ ان احکام کے نفاذ کی اصل ذمے داری پوری امت پر ہے' اس لئے یہ عذر کہ چونکہ ان احکام کے مخاطب اولاالامر ہیں اس لئے امت کے عام افراد کی ان کے سلسلے میں کوئی مسئولیت ہے ہی نہیں۔ ایک واہی عذر ہے اور کسی طرح بھی قابل تسلیم نہیں ہے۔

البتہ اس سلسلے میں ایک بات ضرور صحیح ہے' صرف صحیح ہی نہیں بلکہ قطعا" ضروری بھی ہے' اور وہ یہ کہ ان قوانین کا اجراء اولوالامر ہی کے ذریعہ ہو گا کیونکہ نظم مملکت کا تقاضا یہی چاہتا ہے ورنہ معاشرے میں افراتفری پھیل جائے گی اور کوئی اجتماعی

نظام باقی ہی نہیں رہ سکے گا۔ حالانکہ اسلام سے بڑھ کر نظم و انضباط کا اور کوئی خواہاں نہیں۔

اب جب کہ دو باتیں اپنی اپنی جگہ ثابت شدہ اور مسلم ہو چکیں۔ ایک تو یہ کہ اجتماعی احکام کی اصل مخاطب اور ذمے داری پوری امت ہے اور دوسری یہ کہ ان کا بالفعل نفاذ صرف اولوالامر کرتے ہیں تو ان دونوں مسلم باتوں کا متفقہ مطلب یہ ہے کہ اولوالامران احکام کا اجراء و نفاذ پوری امت کی طرف سے اور اس کی نیابت میں کرتے ہیں۔ نہ کہ اصل مخاطب اور ذمے دار کی حیثیت سے۔ اس حقیقت واقعی کے پیش نظر ایسی حالت میں' جب کہ یہ نیابت کرنے والے کسی وجہ سے موجود نہ ہوں یا موجود ہیں مگر وہ اپنا یہ فرض ادا نہ کر رہے ہوں' اس ذمے داری کا رخ لازماً" آپ سے آپ اصل مخاطب' یعنی پوری امت کی طرف ہو جائے گا اور اس کے لئے یہ ضروری ہو جائے گا کہ اگر اولوالامر موجود نہ ہوں تو وہ ان کا تقرر کرے اور اگر موجود ہوتے ہوئے وہ ان احکام کو نافذ نہ کر رہے ہوں تو وہ انہیں اس کے لئے مجبور کرے' یا انہیں ہٹا کر دوسرے لوگوں کو ان کی جگہ پر لائے۔ زیادہ واضح لفظوں میں یوں سمجھئے کہ ان احکام کی نوعیت فرض کفایہ کی سی ہے۔ اگر اولوالامر کے گروہ نے ان کی تعمیل کر دی تو پوری امت کے سر سے یہ فرض اتر جاتا ہے بصورت دیگر یہ ایک اجتماعی گناہ ہو گا جس کا وبال پوری امت پر رہے گا۔

یہاں پہنچ کر ایک اور سوال بھی کیا جائے گا اور وہ یہ کہ ہمارے پاس وہ سیاسی اقتدار کہاں ہے جو ان احکام کے نفاذ کے لئے ضروری ہے اور جس کی موجودگی ہی میں امت اپنے اندر سے اولوالامر کا تقرر کر سکتی اور پھر ان کے ذریعہ اپنے اس فریضے سے عہدہ بر آ ہو سکتی ہے؟ یقیناً" یہ ایک سنجیدہ سوال ہے اور اس بات سے اختلاف کی گنجائش نہیں کہ ایسے احکام کے نفاذ کی اصل ذمے دار اور مخاطب اگر پوری جماعت ہے مگر عملاً" ان کا نفاذ ایک قوت قاہرہ یعنی اقتدار حکومت ہی کی موجودگی میں ہو گا۔ اس اقتدار کے بغیر ان احکام کا جاری کرنا ممکن ہی نہیں۔ اس لئے اس کام کے لئے' یا

یوں کہئے کہ قرآن کے ایک بڑے حصے پر عمل کے لئے سیاسی اقتدار کا وجود ضروری ہے لیکن اس سوال کے سلسلے میں سوچنے کی بات کیا ہے؟ آیا یہ کہ سیاسی اقتدار کے نہ ہونے کی صورت میں ہماری اور آپ کی ذمے داریوں میں کمی آ جاتی ہے؟ یا یہ کہ وہ اور زیادہ سخت اور گراں ہو جاتی ہیں؟ آیا ہم کو خدا کا شکر ادا کرکے اس بات پر اطمینان کا سانس لینا چاہئے کہ چلو قرآن کے ایک حصے پر تو عمل کرنے سے آزادی ہو گئی؟ یا اس اقتدار کے حاصل کرنے کی سعی کرنی چاہئے جس کے نہ ہونے کی وجہ سے ہم اپنے پروردگار کے کتنے ہی احکام پر عمل پیرا ہونے کی سعادت سے محروم ہیں؟ نہ صرف یہ کہ سعادت سے محروم ہیں بلکہ اس کی بندگی کا حق ادا کرنے کی کوئی صورت ہی باقی نہیں رہ گئی ہے اور کتاب الٰہی کو چھوڑ بیٹھنے اور بھول جانے کی قدیم سنت ضلال وہرانی پڑ رہی ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے اپنے دماغ کو منطقیانہ قیل و قال سے پاک کرکے' کان اپنے قلب و ضمیر کی آواز پر لگا لیجئے اور سنئے کہ وہ ان سوالوں کا کیا جواب دے رہے ہیں؟ یقین جانئے جس قلب میں بھی ایمان کی حرارت موجود ہو گی وہ کبھی سکون اور اطمینان کے ساتھ اس صورت حال کو برداشت کرنے کی اجازت نہ دے گا' اس لئے ان احکام کو نافذ کرنے والی قوت کے موجود ہونے کی شکل میں اگر امت پر صرف ایک فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ان کو نافذ کرائے تو اس کے موجود نہ ہونے کی صورت میں اس پر دو فرض عائد ہو جاتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ پہلے وہ اس قوت کو حاصل کرے۔ دوسرا یہ کہ قوت حاصل ہو چکنے پر ان احکام کو نافذ کرائے' کیونکہ یہ ایک مانا ہوا اصول ہے کہ جس چیز پر کسی فرض کی ادائیگی موقوف ہوتی ہے اس کا حاصل کرنا خود فرض ہو جاتا ہے۔ آپ اس شخص کو ملامت کرنے میں شاید ایک لمحہ بھی توقف نہ کریں گے جو نماز اس عذر سے نہیں پڑھتا کہ اسے قرآن یاد نہیں یا جانماز ناپاک ہے اور اس پر یہی الزام لگائیں گے کہ یہ اپنے فرض سے جی چرا رہا ہے' اس کے دل میں نماز کی نہ کوئی اہمیت ہے نہ محبت' ورنہ ایسا عذر لنگ نہ کرتا۔ اور دنیا کے سارے کاروبار چھوڑ کر سب سے پہلے قرآن یاد کرنے کی کوشش میں یا جانماز پاک کرنے کی

تدبیر میں لگ جاتا۔ پھر یہ کتنی عجیب بات ہے کہ مسلمان آج قرآنی احکام کے ایک بڑے حصے کو معطل کر کے صرف اس لئے مطمئن بنا بیٹھا ہے کہ ان پر عمل کرنے کے لئے جس اقتدار کی ضرورت ہے وہ میسر نہیں اور اس جھوٹے اطمینان پر اس کی مومنانہ حس کو ذرا ٹھیس نہیں لگتی۔ اور نہ اس کے تقویٰ پر اس کی نگہ احتساب کوئی حرف رکھتی' نہ اسے اپنا یہ عذر' عذر لنگ معلوم ہوتا ہے۔ وہ ذرا نہیں سوچتا کہ اگر یہ اقتدار اسے میسر نہیں تو اس کا اولین فرض ہے کہ اپنی ساری قوتیں اور تدبیریں صرف کر کے اسے حاصل کرے۔

بلاشبہ یہ ایک بڑا دشوار کام ہے اور یہ اس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کے لئے ساری طاقت نچوڑ نہ دی جائے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مومن کی طاقت خواہ وہ ذہنی اور دماغی ہو' خواہ جسمانی' مالی ہو خواہ جانی' ہے' کس کام کے لئے؟ آخر اس کے دل و دماغ کی قوتیں اور اس کی جان و مال اس کی اپنی ملکیت تو ہیں نہیں کہ انہیں سینت کر رکھے رہے' بلکہ جس روز اس نے ایمان کا اقرار کیا تھا اسی روز یہ چیزیں وہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ' اس کی رضا کے عوض بیچ چکا ہے۔

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ
(توبہ - ۱۱)

اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال جنت کے عوض خرید لئے ہیں۔

اس خرید و فروخت کے ہو جانے کے بعد ان چیزوں کی حیثیت اب اس کے سوا اور کچھ نہیں رہ جاتی کہ وہ اس کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے امانت کے طور پر رکھی ہوئی ہیں۔ "امانت" کے بارے میں یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ جب بھی اس کا مالک اسے طلب کرے بے چون و چرا اس کے حوالے کر دینا امانت دار کا فرض ہے' اس لئے جب تک کوئی مومن اپنے مومن ہونے سے انکار نہیں کرتا اس کا یہ فرض ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے پاس رکھی ہوئی اپنی امانت جب اور جس طرح طلب کرے وہ اسی وقت

اور اسی طرح اسے لا کر حاضر کر دے' یہ بات کہ یہ اپنی امانت اس نے اپنے مومن بندے کے پاس کس لئے رکھ چھوڑی ہے؟ اس کی کتاب ہی بتا سکتی ہے یہ کتاب کہتی ہے کہ:

جَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ (توبہ)

اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کرو۔

بات بالکل واضح ہو گئی' یعنی یہ کہ وہ مقصد' جس پر مومن کی جان و مال خرچ ہونے کے لئے ہے وہ "اللہ کی راہ" دوسرے لفظوں میں اس کا دین ہے اس لئے وہ اپنے فرض بندگی سے سبکدوش اگر ہو سکتا ہے تو صرف اسی شکل میں کہ ان چیزوں کو "اللہ کی راہ" میں نثار کرنے سے دریغ نہ کرے۔ ورنہ جو چیز خدا کی خریدی ہوئی اور ہمارے پاس بطور امانت رکھی ہوئی ہے اسے عند الطالبہ اس کی راہ میں خرچ کرنے سے گریز کرنا کوئی معمولی جرم نہ ہو گا' بلکہ بد ترین قسم کی خیانت اور کمینہ پن ہو گا کہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ شخص اپنے اوپر اتنا بڑا ظلم کر رہا ہے جس کے پاس خدا نے اپنی چند امانتیں اس لئے رکھ چھوڑی ہیں کہ جب اس کی اطاعت امر کی راہ میں کوئی مانع پیش آئے تو وہ ان کے ذریعے اس مانع کو دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے۔ لیکن اس کا حال یہ ہو کہ موانع پیش آنے کی صورت میں بجائے اس کے کہ وہ اپنی امانتوں سے کام لے کر انہیں دور کرے' کرتا یہ ہے کہ موانع کا عذر کر کے اس حکم ہی سے اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دے لیتا ہے اور پھر اطمینان کے ساتھ ان امانتوں کو غاصبانہ طور پر اپنی خواہشوں کی چاکری میں لگائے رکھتا ہے۔

اضطرار کا عذر

یہ عذر لنگ تو ان احکام کے سلسلے میں تھا جن پر غیر اسلامی اقتدار بالا کی موجودگی میں عمل فی الواقع نہیں ہو سکتا۔ اب رہ گئے بعض وہ احکام دین جن پر عمل کرنے سے یہ اقتدار کفر بھی مانع نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی انہیں چھوڑ رکھا گیا ہے' تو ان کے سلسلے

میں یہ عذر پیش کیا جاتا ہے کہ ایسا اضطرار" ہو رہا ہے' اور اضطرار کی حالت میں حرام بھی جائز ہو جاتا ہے غور کیجئے تو صاف نظر آئے گا کہ یہ عذر ہی جیسا بے وزن عذر ہے اور یہ کہ اس طرح کی بات یا تو اپنی عام اجتماعی ذہنیت کے غلط مطالعے کی بناء پر کہی جا سکتی ہے یا پھر رخصت اضطرار کی ضروری حدود اور شرائط سے انتہائی ناواقفیت کی بنا پر۔ چنانچہ آیئے' جس قانون اضطرار کی آڑلی جاتی ہے' اس کے الفاظ دیکھئے۔

فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ

(بقرہ - ۱۷۳)

البتہ جو شخص مجبور ہو جائے (اور بحالت مجبوری حرام کھا کر اپنی جان بچا لے) اس حال میں کہ (اس حرام شے کے کھانے کی نہ تو وہ کوئی رغبت رکھتا ہو اور نہ (ناگزیر مقدار سے) تجاوز کرتا ہو تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ یقیناً" اللہ تعالٰی بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ الفاظ ایک حرام شے کے استعمال کی رخصت دیتے ہیں مگر آپ دیکھتے ہیں کہ یہ رخصت بلاقید و شرط نہیں ہے۔ بلکہ وہ اس کے لئے تین تین شرطیں بھی عائد کرتے ہیں اور اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے ان میں سے ایک ایک شرط کا پورا ہونا ضروری قرار دیتے ہیں۔

ان میں سے پہلی شرط تو یہ ہے کہ حالت واقعی مجبوری کی ہو اور کسب حلال کی تمام تدبیریں اس حد تک بے کار ہو چکی ہوں کہ بس لقمہ حرام کے سوا اب جان بچانے کا کوئی ممکن ذریعہ باقی ہی نہ رہ گیا ہو۔

دوسری شرط یہ ہے کہ حرام کا یہ استعمال "غیر باغ" ہو یعنی دل میں اس کی کوئی رغبت نہ ہو۔ بلکہ اس کا استعمال کیا جائے تو پورے احساس ناگواری اور شدید جذبہ کراہت کے ساتھ کیا جائے۔

تیسری شرط یہ ہے کہ حرام کا یہ استعمال بھی بس اسی حد تک کیا جائے جس حد تک کہ جان بچانے کے لئے ناگزیر ہو۔

اگر ان تینوں شرطوں کے ساتھ کوئی شخص ایک ناجائز شے کا استعمال کرے تو یقیناً اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی کوئی پکڑ نہ ہو گی۔ لیکن اگر ان میں سے کوئی ایک شرط بھی پوری ہونے سے رہ گئی تو پھر اس رخصت سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا اور اگر اس شکل میں بھی اس سے فائدہ اٹھاتا ہے تو یہ اس کی کھلی ہوئی دھاندلی ہو گی اور اسے اللہ تعالیٰ کے حضور اس کا خمیازہ لازماً بھگتنا پڑے گا۔

اسلامی قانون اضطرار کی وضاحت آپ کے سامنے آچکی۔ اب اس کی روشنی میں اپنے اجتماعی طرز عمل کا ٹھیک ٹھیک جائزہ لیجئے اور پھر اپنی ملت کے ان خدا پرستوں کی تعداد بتایئے جو اقتدار باطل کے زیر سایہ زندگی بسر کرنے "مسرفین" کی اطاعت کرنے' لادین اسمبلیوں میں جا کر قانون ساز بننے' غیر اسلامی عدالتوں میں اپنے معاملات لے جانے اور طاغوتی قوانین کے مطابق فیصلہ کرنے میں وہی مجبوری' وہی ناگواری اور وہی کراہت محسوس کرتے ہوں جو ایک مومن کی سور کی بوٹی حلق سے نیچے اتارنے میں محسوس ہو سکتی ہے۔ کیا کروڑوں انسانوں کا یہ بھاری انبوہ غیر اللہ کی حاکمیت اور مشرکین کی اطاعت کو حقیقتاً اسی اضطرار کے ساتھ برداشت کر رہا ہے جس کا قرآن میں ذکر ہے؟ کیا مسلمانوں کے یہ گروہ' جو صبح سے شام تک طاغوتی عدالتوں کا طواف کیا کرتے ہیں۔ یہ سب اپنے اس فعل کو اصلاً حرام ہی سمجھتے اور اس کو محض انتہائی مجبوری کے وقت ہی اختیار کرتے ہیں؟ اور ان میں اپنی اغراض نفس کی پیروی حدود اللہ سے بے اعتنائی اور احکام شریعت سے سرتابی کا کوئی داعیہ کارفرما نہیں ہوتا؟ کیا وہاں وہ فی الواقع صرف اس لئے جاتے ہیں کہ انہیں اپنی جان و مال کی حفاظت کا کوئی امکانی راستہ باوجود جستجو کے نہیں ملتا؟ کیا یہ جج اور مجسٹریٹ صاحبان جو اپنی زندگیاں غیر اسلامی آئین و قانون کے مطابق داد انصاف دینے میں گزار دیتے ہیں درحقیقت "مخمصہ" (فقر و فاقہ) ہی کے شکار ہوتے ہیں اور اپنی اسی مجبوری کی بنا پر اپنے مشغلے کو گوارا کرتے ہیں کیا جس وقت وہ اللہ جل مجدہ' کے قوانین پس پشت ڈال کر خدا ناشناس انسانوں کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق معاملات کا فیصلہ کرتے ہیں۔ تو ان کا دل اپنے اس فعل

کی برائی کا کوئی احساس رکھتا ہوتا ہے اور اپنی اس حالت پر کڑھ رہا ہوتا ہے؟ کیا وہ یہ کام بالکل غیر باغ ولا عاد ہو کر انجام دیتے ہیں؟ اگر ان سوالوں کا جواب نفی میں نہیں ہے تو یقیناً یہ سب لوگ "فلا اثم علیہ" کی رخصت اور رعایت کے مستحق ہیں۔ کاش ایسا ہی ہوتا۔ مگر خود احتسابی کی جرأت سے کام لے کر حقیقت حال کا جائزہ لیجئے تو مشاہدہ آپ کو یہ ماننے پر مجبور کر دے گا کہ ان عدالتوں میں جاتے وقت یا ان کی کرسیوں پر بیٹھتے وقت شرط اضطرار کی ضرورت کا "مجوزہ" تصور تک نہیں پیدا ہوتا۔ ان کرسیوں تک وہ مسلمان پہنچتا ہی کب ہے جو فقر و فاقہ کے ہاتھوں مجبور ہو اور جس کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار رہ ہی نہ گیا ہو کہ بقائے حیات کی خاطر بس یہی رزق خبیث قبول کر لے۔ ان جگہوں تک تو پہنچ ہی وہ لوگ پاتے ہیں جو پہلے ہی سے آسودہ حال ہوتے ہیں۔ یا کم از کم یہ کہ اس انتہائی قسم کے افلاس میں مبتلا نہیں ہوتے جس کو مخمصہ کہا جا سکے۔ اس لئے تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ سب کچھ نہایت ٹھنڈے دل سے اور شوق رغبت کے ساتھ کیا جا رہا ہے اولاد کو تعلیم دے کر تیار ہی اس لئے کیا جاتا ہے کہ ان کرسیوں تک پہنچ جائیں اور جو پہنچ جاتا ہے وہ ترقی درجات کی کوششوں میں مصروف رہتا ہے حالانکہ اگر واقعتاً اضطراری حالت ہی کی وجہ سے کوئی یہ ذریعہ معاش اختیار کئے ہوتا تو اس کے اطمینان کا فطری تقاضا یہ تھا کہ اس پر ہرگز مطمئن نہ ہوتا اور اسے چھوڑ کر کوئی جائز ذریعہ معاش پا لینے کے لئے بے چین رہتا۔ مگر ایسے لوگ چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی شاید نہ مل سکیں۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کھلی ہوئی طاغوت نوازی کو اضطرار کا نام کس طرح دیا جا سکتا ہے؟ اس طرح اگر فی الحقیقت ہم غیر اللہ کی حاکمیت کے دل سے منکر ہوتے اور ہماری غیرت ایمانی اس سے متنفر ہوتی تو ہم یوں گھروں کے عیش اور مدرسوں کی قیل و قال اور حجروں کی ہائے ہو میں سکون کے ساتھ مشغول نہ رہتے' اگر ہم سے کچھ نہ بن پڑتا تو کم سے کم یہ تو کرتے ہی کہ اس "منکر اعظم" کے ساتھ کسی قسم کا تعاون نہ کرتے اور نہ اس کے سلسلے میں کسی اعتقادی اور قولی مداہنت کے روادار ہوتے۔ اس کے بخلاف

ہوتا یہ کہ وہ اپنی زبان کی پوری قوت سے اس کی کھلی مخالفت کرتے اور اگر یہ بھی نہ ہو سکتا تو اس سے دلی نفرت تو بہرحال رکھتے ہی۔ کیونکہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق یہ ایمان کی آخری حد ہے آپ برائیوں اور برے لوگوں کے سلسلے میں اہل ایمان کا رویہ بتاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

مَنْ جَاهَدَهُمْ بِيَدِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِلِسَانِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَ مَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ لَيْسَ وَرَاءَ ذَالِكَ مِنَ الْاِيْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ (مسلم - جلد اول)

جس نے ان سے اپنے ہاتھ کے ذریعے جہاد کیا وہ مومن ہے، جس نے اپنی زبان کے ذریعے جہاد کیا وہ (بھی) مومن ہے جس نے اپنے دل کے ذریعہ جہاد کیا وہ (بھی) مومن ہے اس کے بعد رائی برابر بھی ایمان (متصور) نہیں۔

مگر یہاں حال یہ ہے کہ اتنی بڑی برائی سے کسی نفرت اور کراہت کی ضرورت کا سوال تو الگ رہا۔ اسے برا سمجھنا بھی چھوڑ دیا گیا ہے حتیٰ کہ اس کے قیام کے لئے حلف وفاداری اٹھا لینے میں بھی کوئی مضائقہ باقی نہیں رہ گیا ہے اور اس کی بقا کے لئے علانیہ جسم و دماغ کی ساری قوتیں نثار کی جارہی ہیں۔ کیا ایک قابل نفرت شے سے یہی برتاؤ کیا جانا چاہئے؟ ایسی کھلی ہوئی برائیوں کے بارے میں بھی اگر ایمان کے اس کم سے کم تقاضے کا اظہار نہ ہو سکا جس کی حدیث مذکور میں وضاحت کی گئی ہے تو پھر ایسے ایمان کو زندہ ایمان کیسے کہا جا سکتا ہے؟ آخر اضطرار کی بھی تو کوئی حد ہونی چاہئے۔ اگر اس کے دامن کو اتنی وسعت دے دی جائے، جتنی کہ ہمارے عام رویے سے ظاہر ہو رہی ہے تو یقین رکھنا چاہئے کہ دنیا کی کوئی برائی اور قرآن کی کوئی قانون شکنی بھی اس کے دائرے سے باہر نہیں رہ سکتی۔ ایسی حالت میں تو ایک "مسلمان" اپنے نفس کی پیروی اسی آزادی سے کرتا رہے گا، جس آزادی سے خدا کے منکر کیا کرتے ہیں اور اخلاق و خدا پرستی کے وہ سارے اصول و ضوابط بیکار رہ جائیں گے جن کی تعلیم کے لئے قرآن کو اتارا اور صاحب قرآن کو بھیجا گیا تھا لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ اضطرار کا یہ

وہ من مانا مفہوم ہے جس سے اللہ تعالیٰ اور رسولؐ بالکل بری ہیں۔

ہم اس پستی تک جس طرح پہنچتے ہیں اسے بھی سمجھ لینا چاہیے۔ ہوتا یہ ہے کہ جب ایک برائی کسی سوسائٹی میں پہلے پہل نمودار ہوتی ہے تو سوسائٹی کا اجتماعی ضمیر اس پر نفرت اور ملامت کا اظہار ضرور کرتا ہے لیکن اس نفرت اور ملامت کا جذبہ قوی اور عام ہوتا ہے تب وہ برائی دب جاتی ہے' ورنہ وہ جڑیں پکڑنے لگتی اور آہستہ آہستہ برگ و بار لانے لگتی ہے۔ اب اگر اس سوسائٹی کے خیرپسند لوگ بھی اپنے امکان بھر اس کی جڑیں اکھیڑنے کی کوشش میں برابر لگے نہ رہیں اور اس کے خلاف رسمی اظہار خیال کر دینے ہی کو کافی سمجھ لیں تو رفتہ رفتہ ان کے اندر سے بھی اس کی نفرت کا احساس مدھم ہوتا چلا جاتا ہے اور زیادہ دن نہیں گذرنے پاتے کہ وہ برائی برائی نہیں رہ جاتی اور خاص و عام کم و بیش بھی اس کے رنگ میں رنگے نظر آنے لگتے ہیں۔ وہ اس وقت معاشرے کی ایک ضرورت بن جاتی ہے اس پر استحسان یا کم از کم اباحت کا ٹھپہ لگا دیا جاتا ہے اور اس کے اپنی اصولی اخلاقیات تک میں رد و ناگوار نہیں رہ جاتا۔ یہ ایک مسلمہ نفسیاتی حقیقت ہے اور سوسائٹی میں برائیوں کا پھیلاؤ ہمیشہ اسی پرواز پر ہوتا رہا ہے یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کو جہاں اس بات کی ہدایت کی گئی تھی کہ :-

وَاللّٰہِ لَتَامُرُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلَتَنْھَوُنَّ عَنِ الْمُنْکَرِ ..... الخ (الحدیث)

بخدا تم معروف کا حکم ضرور ہی کرتے رہنا اور منکر سے ضرور روکتے رہنا

وہیں اس بات سے بھی خبوار کر دیا گیا تھا کہ :

اولیضر بن اللہ بقلوب بعضکم علی بعض (ابوداؤد بحوالہ ریاض الصالحین)

ورنہ اللہ تعالیٰ تم سب کے دلوں کو ایک جیسا (منکرپسند) بنا دے گا۔

لیکن بدقسمتی سے مسلمانوں نے اس ہدایت اور اس تنبیہہ کو اپنے دماغوں میں محفوظ رکھا اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ برائیوں میں غرق ہو جانے کے مذکورہ بالا نفسیاتی اصول نے انہیں پوری طرح اپنی زد میں لے لیا۔ جس وقت فکری گمراہیوں اور عملی

خرابیوں نے ان کے اندر گھسنے کی کوشش کی انہوں نے ان کی مسلسل مزاحمت نہیں کی۔ اور آہستہ آہستہ ان سے مانوس ہوتے گئے۔ پھر جب اسی حالت پر صدیاں گزر گئیں تو اب وہ صورت پیدا ہو چکی ہے۔ جس کا ہم مشاہدہ کر رہے ہیں۔ یعنی عام مسلمانوں کے دل' ان کے دماغ' ان کے نقطہ ہائے نظر اور ان کے انداز فکر بھی بدل کر کچھ سے کچھ ہو چکے ہیں۔ جس چیز سے نفرت ہونی چاہئے تھی اس سے رغبت کی جا رہی ہے جس چیز سے بھاگنا چاہئے تھا اس کی طلب میں دوڑ لگائی جا رہی ہے۔ جس چیز کو پیروں تلے روند ڈالنا چاہئے تھا' وہ دانتوں سے پکڑی جا رہی ہے۔ ان کے پیغمبر نے انہیں ایمان کی آخری حد یہ بتلائی تھی کہ برائی کوئی بھی ہو اس سے دل میں نفرت رکھی جائے۔" ایسی نفرت جو اس برائی کو مٹا ڈالنے کے لئے برابر ابھارتی رہے اس سے پیچھے ایمان کا کوئی درجہ ہی نہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی برائی کا پسند کرنا ہی ایمان کے منافی نہیں قرار دیا تھا۔ بلکہ اسے دیکھ کر اپنے اندر جذبہ نفرت نہ پانے کو بھی ایمانی موت کی یقینی علامت ٹھیرایا تھا۔ مگر اب آپ کے پیروؤں کو اس امر پر اصرار سا ہے کہ ہم کسی کراہت اور احساس نفرت کے بغیر انسانی حاکمیتوں کو سلامیاں دیں گے۔ ان کی اطاعتوں کا جوا اپنی گردنوں پر رکھیں گے۔ ان لوگوں سے اپنے معاملات کا فیصلہ کرائیں گے جنہوں نے اپنی "عدالت گاہوں" میں خدا کا "داخلہ" بند کر رکھا ہے بلکہ خود بھی انہی کے بتائے ہوئے قوانین کے مطابق فیصلے کریں گے اور اگر موقع ملا تو خود بھی اپنی حاکمیت کا پھریرا لہرا دیں گے۔ اپنی آزاد مرضی سے قانون سازیاں کریں گے جس چیز کو چاہیں گے جائز اور جس کو چاہیں گے ناجائز ٹھیرائیں گے اور پھر نہ ہمارا دین جائے گا نہ ہمارا ایمان خراب ہو گا۔ نہ ہماری توحید متاثر ہو گی۔ نہ ہماری عبودیت پر حرف آئے گا' نہ ہمارا اتباع رسولؐ کا دعویٰ غلط ٹھیرے گا' نہ ہم پر کتاب الٰہی کے چھوڑ بیٹھنے کا الزام عائد ہو گا اور نہ ہم اپنے اللہ سے عہد شکنی کے مجرم ہوں گے کیوں؟ اس لئے کہ ہم حالت اضطرار میں ہیں۔

اسے فریب نظر کہئے یا فریب نفس' بہرحال اس میں ذرا شک نہیں کہ یہ ایک

انتہائی مہلک اور خطرناک فریب ہے اس کی خطرناکیوں اور ہلاکتوں کا پورا پورا اندازہ آپ کو اس وقت ہو سکتا ہے جب آپ اس کے دوررس نتائج کا قدرے تفصیلی جائزہ لے لیں جو ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگیوں پر مرتب ہوتے ہیں۔

غیر اللہ کی حاکمیت میں ایک وفادار رعایا بن کر رہنے کے معنی یہی نہیں ہیں کہ ہم نے اسلام کی ایک بنیادی تعلیم کی خلاف ورزی کی۔ بلکہ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ اب ہماری پوری زندگی' شعوری یا غیر شعوری طور پر ایسے سانچے میں ڈھلتی چلی جائے گی جو اسلام کے مطلوبہ سانچے سے بالکل مختلف ہو گا۔ اب ہمارے معاشرے کی تاسیس' ہمارے تمدن کی اٹھان' ہمارے نظام تعلیم کی تربیت اور ہمارے معاشی اور اقتصادی مسائل کی تنظیم ایسی بنیادوں پر ہو گی جو ہماری خواہشوں کے علی الرغم' ہم کو اپنے اجتماعی مسلک اور اپنے تصورات زندگی سے دور پھینکتی چلی جائیں گی۔

غیر الٰہی قوانین کے مطابق فیصلہ کرنے اور کرانے کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ ایک گناہ سرزد ہو رہا ہے' بلکہ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ ان بہت سے احکام اسلامی کو لپیٹ کر رکھ دیا گیا۔ اور ان کی وقعت دلوں سے محو ہو جانے دی گئی جو ہماری زندگی کے ایک دو نہیں بلکہ بے شمار معاملات سے تعلق رکھتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اپنے دین اور قرآن کو سمیٹ کر مسجدوں اور حجروں میں بند کر دیا اور اس کے صرف اتنے حصے پر اکتفا کر لیا جس کا تعلق بس چند مذہبی رسوم اور عبادات سے ہے۔

یہ محض عالم قیاس کی باتیں نہیں ہیں بلکہ واقعات اور حقائق ہیں جنہیں ہر وہ شخص اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے جس نے اپنے دینی احساس کو کند نہ بنا لیا ہو۔ ملت کے علم برداروں نے قرآن کے ایک حصے کو اقتدار کے حاصل نہ ہونے کا عذر کر کے اور اولوالامر کو اس کا بنیادی مخاطب قرار دے کر' اور پھر اضطرار کی آڑ لے کر زمانہ سازی کی جو روش اختیار کی تھی اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ قرآن کے کتنے ہی احکام اور اصول سے ان کا علمی رشتہ کٹ کر رہ گیا ہے اور دین کے ان بنیادی اصولوں

اور اس کے ان اہم تقاضوں سے اس جبری علیحدگی پر ایمانی خودی مضطرب تو ضرور ہوئی' مگر جوں جوں وقت گزرتا گیا یہ اضطراب سکون و اطمینان سے بدلتا گیااور اب نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ دین صرف انہی چند عبادات اور مذہبی رسوم تک محدود ہو کر رہ گیا ہے جن کو لوگ عموماً" ادا کرلیا کرتے ہیں اور ان کے علاوہ جو کچھ ہے دین سے اس کا تعلق' غیر محسوس طور پر' بس برائے بیت ہی خیال کرلیا گیا ہے۔ اگر فکر و نظر کے زوایے ایسے نہ بن گئے ہوتے تو یہ کیسے ممکن تھا کہ ان اجزائے دین پر اگر عمل نہیں ہو رہا تھا تو اسی کے ساتھ ان کی نظری اہمیت بھی گھٹ جاتی؟ اور اس حد تک گھٹ جاتی کہ دل ان کے لئے کسی اضطراب' کسی تمنا' اور کسی حسرت سے بھی محروم ہو جاتے؟ ہم تو دیکھتے ہیں کہ مسجد کی ایک اینٹ بھی اگر کھود کر پھینک دی جائے تو اس گئی گذری حالت میں بھی مسلمانوں کی گردنیں خون کے دریا بہانے کے لئے تیار ہو جاتی ہیں۔ مگر اللہ کے بے شمار احکام کی مظلومیت پر بہانے کے لئے ان کے پاس چند قطرے آنسو بھی نہیں ہوتے۔ اس فرق کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ تو دین کا کام سمجھا جاتا ہے اور یہ کچھ دنیا کا۔ لیکن چونکہ یہ احکام بھی اسی قرآن میں موجود ہیں' جس میں ان چند مخصوص عبادات اور رسوم کا ذکر ہے اور ہر حکم کے اتباع کا قول دیا گیا ہے جو قرآن و سنت میں ہو۔ اس لئے زبان سے یہ کہنے کی جرات تو نہیں ہوتی کہ یہ احکام دین سے غیر متعلق ہیں مگر جب ان پر عمل کرنے اور ان کے سلسلے میں دیئے ہوئے قول کو پورا کرنے کا سوال پیدا ہوتا ہے تو غیر شعوری طور پر دین کا وہی محدود تصور اور سہل پسندی کا مخفی جذبہ کبھی ان احکام کا اصل مخاطب بننے ہی سے انکار کرا دیتا ہے اور کبھی رخصت اضطرار کی ڈھال ہاتھ میں تھما دیتا ہے۔

غرض حقیقت حال اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ غیرت ایمانی کی کمی' احساس فرض کی پژمردگی اور سہل پسندی کے غلبے نے کافرانہ اقتدار اور باطل اصول و نظریات کے سامنے سپر ڈالنے پر آمادہ کیا۔ پھر اس آمادگی نے قرآن کے ایک بڑے حصے کو عمل و اتباع کی حدود سے خارج کردینے پر مجبور کردیا۔ بعد ازاں اس مجبوری نے خدا پرستی کا

بھرم رکھنے اور اپنی نگاہوں سے آپ اپنی خطاکار صورت چھپائے رکھنے کے لیے دین کے تصور ہی کو محدود اور بے روح بنا کر رکھ دیا۔ ایسا محدود کہ جن احکام پر عمل نہیں ہو رہا ہے نظری طور پر بھی وہ ہماری آزاد روی پر کبھی انگلی تک نہ اٹھا سکے۔ پھر اس محدود اور بے روح تصور دین نے ملت کی اس عظیم معصیت اور بے عملی کے اس احساس کو بھی سلا دیا۔ سب سے آخر میں سیاسی اقتدار سے محرومی اور اضطرار کے حیلے آئے' اور انہوں نے آکر ان تمام رخنوں کو ڈھک لیا جو ہزار کوششوں کے باوجود ان نظریات کے اندر دکھائی پڑ ہی جاتے تھے۔ اور اب یہ تمام چیزیں ایک دوسرے سے غذا حاصل کر رہی ہیں اور سب نے مل کر مغالطوں اور خوش فہمیوں کا ایسا جال تیار کر دیا ہے جس کے اندر غور و فکر کی قوتیں صیدزبوں بن کر رہ گئی ہیں۔ نتیجہ اس پوری صورت حال کا یہ ہے کہ مسلمان پر حقیقت بینی کی راہ بند سی ہو گئی ہے اور اس میں تلاش منزل کی امنگیں بھی دم توڑتی جارہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سب سے بڑی بدقسمتی ہے جس میں کوئی مسلمان مبتلا ہو سکتا ہے۔ اگر ایک شخص میں اپنی غلطی کا احساس زندہ ہو تب تو یہ امید ضرور کی جا سکتی ہے کہ وہ ایک نہ ایک دن اس کی اصلاح کرے گا۔ لیکن اگر یہ احساس ہی مردہ ہو گیا اور اس کی نظر میں غلطی غلطی ہی نہ رہ گئی تو پھر اس کے اصلاح پذیر ہونے کی کوئی توقع باقی نہیں رہ جاتی۔ اس لیے اگر اس ملت نے اپنی کامل تباہی اور دین و دنیا دونوں کی رسوائی کا تہیہ نہ کر لیا ہو تو اسے چاہیے کہ اپنی بے گناہی کے زعم باطل سے جلد از جلد باز آجائے اور اتباع دین کے معاملے میں جو کوتاہیاں اس سے سرزد ہوتی چلی آرہی ہیں ان کو سیدھی طرح تسلیم کرکے اس کی تلافی کی کوشش کرے۔

نگاہ مسلم کی بے بصیرتی

اللہ تعالیٰ کی ہدایت بخشی کا معاملہ بھی عجیب شان رکھتا ہے۔ ایک ہی چیز ہوتی ہے جس سے کسی کے سامنے ہدایت کے دروازے کھل جاتے ہیں اور وہ حقیقت کو

پالیتا ہے۔ مگروہی چیز دوسروں کے لیے ضلالت کا پیام بن جاتی ہے۔ اور وہ اس کے باعث راہ راست سے اور دور ہوجاتے ہیں۔ اس معاملے کی بنیاد اللہ تعالیٰ کے اس قانون عدل پر ہے کہ جو حق کی سچی طلب رکھتا ہے اس کے سامنے اسکی راہ کھولی جاتی ہے اور جو حق سے بے اعتنائی برتتا ہے اس کے سامنے اس کی تجلی کبھی نہیں چمکتی۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ سورج کی کرنیں بینائی والوں کے لئے پوری دنیا کو روشن کردیتی ہے۔ مگر الوؤں اور چمگادڑوں کی نگاہیں اپنے جبلی نقص کی بنا پر ان کے فیضان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا پائیں۔ چنانچہ قرآن نے اپنی صفت جہاں یہ بتائی ہے کہ میں لوگوں کے لیے مشعل ہدایت ہوں۔ وہیں یہ بھی کہا ہے کہ میں بہتوں کے لیے گمراہی کا ذریعہ بھی ہوں۔ (یُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِىْ بِهٖ كَثِيْرًا) (بقرہ) اس کے اس قول میں اسی قانون ہدایت کی طرف اشارہ ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ راہ راست اسی شخص کو دکھاتا ہے جو دیکھنا چاہے اور اسی وقت دکھاتا ہے جب دیکھنے کی اسے حقیقی آرزو ہو۔ لیکن جو اپنی آنکھیں بند ہی رکھتا ہے۔ اسے زبردستی دھکیل کر اس راہ پر ڈال نہیں دیا جاتا۔ بلکہ اس کے برعکس ہوتا یہ ہے کہ اس بے اعتنائی کے ردعمل میں وہ اس سے کچھ اور دور جا پڑتا ہے۔ یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ یہ قانون صرف کفار ہی کے لئے ہے' اور مومن چونکہ اس پر ایمان لا چکے ہیں اس لئے اب وہ قانون کے دائرہ نفاذ سے باہر ہیں۔ نہیں' بلکہ یہ کافر اور مومن سب کے لئے عام ہے۔ ایک مومن بھی قرآن پر ایمان رکھنے کے باوجود زندگی کے مختلف معاملات میں اس سے کسب ہدایت اسی وقت کر سکتا ہے جب وہ پورے اخلاص کے ساتھ اس کی خواہش اور کوشش بھی کرے۔ ورنہ جس وقت بھی اور زندگی کے جن معاملات میں بھی' اس نے اس سے رہنمائی کی خواہش نہ کی' اور غیر مشروط طور پر اس کی پیروی کرنے کی اور اس غرض سے اس کا زاویہ نگاہ معلوم کرنے کی کوشش نہ کی' تو یقیناً" وہ اس کو گمراہیوں کی تاریکیوں میں بھٹکتا چھوڑ دے گا اور اس بات کا لحاظ نہ کرے گا کہ وہ میرا منکر نہیں' بلکہ میرا ماننے والا ہے یہی وجہ ہے کہ مومن کو اس امر کی تلقین کی گئی ہے کہ ایمان

لائے اور ہدایت پا لینے کے بعد بھی اپنے قلب و نظر کو کجروی سے مامون نہ سمجھے' اور ہر وقت اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا رہے کہ خدایا! میرے سامنے سے ہدایت کی روشنی گل نہ ہونے پائے۔ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا (آل عمران ۔ ۸)

قرآن کے ان احکام کے بارے میں جو اس وقت زیر بحث ہیں دراصل یہی قانون ہدایت کام کر رہا ہے چونکہ ان کے سلسلے میں امر حق معلوم کرنے کی سچی خواہش باقی نہیں رہی اس لئے نتیجہ اس کے بغیر اور کیا نکل سکتا تھا کہ جہاں سے سمت منزل کی رہنمائی ہو رہی تھی ٹھیک اسی جگہ سے بھٹکنے کا سامان فراہم کر لیا گیا۔ قرآن و سنت میں جو اس انداز خطاب کے ساتھ احکام آتے ہیں کہ اے مومنو! ایک خدا کی فرمانروائی کے آگے خود جھکو اور سارے عالم کو اسی راہ راست کی طرف بلاتے رہو' اے ایمان رکھنے والو! کفر کے علمبرداروں سے لڑ کر فتنہ و فساد کا سر کچل دو' اے اہل ایمان! زانی کو درے لگاؤ' وغیر ذالک .... تو اس انداز خطاب کی اصل بنیاد ایک ایسی عظیم الشان حقیقت پر تھی کہ اس کا صحیح تصور ہی اس کارگہ حیات میں مومن کا مقام متعین کر دینے کے لئے کافی تھا۔ اگر ہم امر حق کی سچی طلب لے کر قرآن پر نگاہ ڈالتے تو پاتے کہ یہ طرز خطاب اس امر کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں اس امت کی حیثیت ایک صاحب اقتدار پارٹی سے کم کی ہے ہی نہیں۔ وہ اس کا مقام رہبانیت کے حجروں میں یا محکومی کے جوئے تلے نہیں' بلکہ امامت جہانبانی کے تخت پر بتا رہا ہے اور اس مقام سے نیچے وہ اس کی حیثیت کو فرض ہی نہیں کرتا' نہ اس سے نیچی سطح پر وہ کبھی اسے دیکھنا چاہتا ہے۔ سوچئے تو سہی' ملی زندگی کا کتنا بلند تصور تھا۔ جو اس اسلوب بیان کے پیچھے موجود ہے اور قلب مسلم کو کیسے پاکیزہ اور عالی عزائم سے معمور کر دینے والا پیام تھا جو یہ اشارہ قرآنی دے رہا ہے؟ مگر قصور نظر کا برا ہو۔ اس چشمہ حیوان کو بھی ہم نے اپنے لئے بحر ہلاکت بنا لیا۔ چاہئے تو یہ تھا کہ اللہ رب العزت کے اس طرز خطاب کی حکمت کو سمجھ کر اپنا کھویا ہوا مقام اور بھولا ہوا فریضہ یاد کر لیا جاتا' اپنی کوتاہیوں پر نادم ہو کر ان کی تلافی کی کوشش کی جاتی اور پھر اس مقام

کی بازیافت کی سرفروشانہ جدوجہد میں لگ جایا جائے۔ جہاں ہمارا آقا ہم کو دیکھنا چاہتا ہے اور جہاں پہنچے بغیر ہم اس کے بہت سے احکام کی تعمیل اور اس کی پوری پوری رضا مندی کی تحصیل کر ہی نہیں سکتے۔ مگر افسوس کہ یہ کچھ بھی نہ ہوا۔ بلکہ یہ کہہ کر ان احکام کے مخاطب تو حکام اور اولوالامر ہیں۔ ہم نے اپنی ذمے داری کا بوجھ ہی اتار کر پھینک دیا۔

بالکل اسی انداز سے آیت اضطرار پر بھی نظر ڈالی گئی۔ غیر باغ ولا عاد کی شرطوں میں غیرت حق کے تحفظ کا جو راز چھپا ہوا تھا' اور ناموافق سے ناموافق مواقع میں بھی اپنے ایمانی ذوق کی بلندی برقرار رکھنے کا ان میں جو مطالبہ موجود تھا اس کی طرف نظریں گئی ہی نہیں یا گئی ہوئی نظریں پھیرلی گئیں اور فلا اثم علیہ پر انہیں لاکر اس طرح جمادیا گیا کہ پھر دین کی پیروی میں نہ کسی قربانی کا سوال باقی رہ گیا نہ وہ نفس پر کچھ ایسی گراں رہ گئی۔ بلاشبہ اس آیت میں بحالت مجبوری حرام سے استفادے کی رخصت عطا کی گئی ہے لیکن یہ آیت کا صرف ایک پہلو ہے اور اس کا ایک پہلو اور بھی ہے ضروری ہے کہ وہ بھی نگاہ میں رہے' آیت کے اس دوسرے پہلو کی ترجمانی غیر باغ ولا عاد کے الفاظ کرتے ہیں ان لفظوں میں حرام سے استفادہ پر جو شرطیں لگائی گئی ہیں ان کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ مسلمان اگر کسی حرام سے استفادہ کرنے پر مجبور ہو جائے تو چاہئے کہ اسے استعمال کرتے وقت اپنے اندر اس کی کوئی رغبت محسوس نہ کرے اور نہ بالکل ناگزیر مقدار سے زیادہ اسے استعمال کرے بلکہ ان کا مطلب یہ بھی ہے کہ اس حالت سے نکلنے اور اس استعمال حرام سے نجات پا جانے کی اسے گہری فکر اور بے تابانہ کوشش کرنی چاہئے' بالکل اسی طرح جس طرح کہ کسی شخص کا پاؤں اگر نکیلے اور تپتے ہوئے سنگریزوں پر پڑجاتا ہے تو وہ تلملا کر اسے جلد از جلد اٹھا لینا چاہتا ہے جب تک اس حالت سے نجات نہ مل سکے بس یوں سمجھتا رہے کہ مردار کا سڑا گوشت ہے جس کو دانتوں سے نوچ رہا ہوں۔ یا خنزیر کی بوٹیاں ہیں جن کو نگل رہا ہوں' یا سڑاند بھری غلاظت ہے جس سے جسم اور کپڑے لت پت ہو

گئے ہیں۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ آیت کا یہ پہلو بھی اگر ہماری نظروں میں ہوتا اور اس کے بتائے ہوئے اس ایمانی ذوق کے اگر ہم قدر شناس ہوتے تو اس وقت ہماری دنیا یہ دنیا نہ ہوتی اور وہ شکست خوردہ ذہنیت' وہ پست نقطہ نگاہ اور وہ ایمان سوز طرز فکر ہماری قوتوں کو اس طرح مفلوج نہ کر دیتا اور کروڑوں انسانوں کو اتنی بھاری جمعیت اضطرار کے نام پر صدیوں تک باطل کے ساتھ اس طرح کی قابل شرم سازگاری نہ دکھاتی کہ اتباع قرآن کے دعوی رکھنے کے باوجود اس کا ضمیر کبھی اسے جھٹکا دیتا ہے نہ اس کی ایمانی غیرت کبھی اس کا دامن پکڑتی ہے اس کے بخلاف ہوتا یہ کہ باطل افکار' غلط نظریات اور غیر اسلامی نظامہائے حیات کے خلاف ہم مجسم احتجاج ہوتے۔ ہمارا ایمانی مزاج ہماری زندگی کو تلخ بنا دیتا اور ہماری اسلامی حس ہمیں مجبور کر دیتی کہ اس گندگی کو جس طرح بھی ہو سکے اپنے دامن سے دھو کر دم لیں۔ لیکن افسوس ہے کہ ہم کو اضطرار کی رخصت تو یاد رہ گئی مگر "غیر باغ و لا عاد" کی شرطیں اور ان شرطوں کے تقاضے سب فراموش ہو گئے۔

امید ہے ان بحثوں کے بعد یہ اب کوئی مشکوک حقیقت نہ رہ گئی ہو گی کہ دین کے جزوی اتباع پر مطمئن رہنا اور اسے اپنے ایمانی فرائض سے عہدہ برآ ہو سکنے کے لئے کافی سمجھ بیٹھنا کسی طرح صحیح نہیں۔ یہ ایک ایسی غلط فہمی' بلکہ نافہمی ہے جسے افسوس ناک بھی کہنا چاہئے اور خطرناک بھی۔ ایسا سمجھنا دراصل ایمان کے بے جان ہونے کی دلیل ہے یا پھر دین کی بصیرت سے محروم ہو جانے کا ثبوت' یہ فریب نفس کا ایسا خطرناک طلسم ہے جو اگر پوری قوت سے نہ توڑا گیا تو قلب ملت کی وہ کمزور دھڑکنیں بھی ختم ہو جائیں گی جو ابھی تک کبھی کبھی محسوس ہو جایا کرتی ہیں۔

۲۔ ناسازگار حالات کا عذر

اب اس گروہ کے خیالات کو لیجئے جو اس نصب العین اور واحد فریضہ حیات کی بجاآوری سے اس لئے کترا رہا ہے' اور دوسروں کو بھی کترا کر چلنے کا مشورہ دے رہا ہے کہ موجودہ حالات اس کام کے لئے کسی طرح سازگار نہیں اور ان کے اندر اس کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں۔ پھر حالات کے اس مطالعہ کا تقاضا وہ یہ بتاتا ہے کہ فی الحال اس کام کا نام بھی نہ لیا جائے اور اس کے بجائے اپنی ساری قوتیں کسی ایسے مورچہ پر سمیٹ دی جائیں جہاں سے ہم حالات کی رفتار پر اس طرح اثر انداز ہوں سکیں کہ مستقبل کی فضا اس کام کے لئے اتنی تاریک نہ رہ جائے۔ یہاں تک کہ ایک وقت چل کر ہم اپنی اس حقیقی منزل مقصود کی طرف علانیہ مارچ کر سکیں۔

چند تنقیحی سوالات

اس نظریئے پر غور کیجئے تو قدرتاً" ذہن میں یہ چند سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

۱۔ کیا اس فریضے کی ادائگی کے لئے براہ راست جدوجہد کرنے میں حالات کی ناسازگاری اور اس جدوجہد کی کامیابی کے امکان و عدم امکان کی بحث پیدا بھی ہو سکتی ہے؟

۲۔ کیا آج کے حالات میں دین کی اقامت واقعی ناممکن ہے؟

۳۔ ناسازگاری حالات کی بنا پر اس حول کی طرف پھیر کے راستوں سے پیش قدمی کرنے کی کوئی عملی مثال' کوئی انسانی تجربہ' یا کوئی صحیح فکری بنیاد موجود ہے؟

ان سوالوں کا صحیح جواب جب تک معلوم نہ ہو جائے اس نظریئے کا حق یا ناحق ہونا بھی معلوم نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ضرورت ہے کہ اللہ کی کتاب اور اس کے پیغمبروں کے طریق کار اور اسوہ اعمال سے ان کے واضح جوابات حاصل کئے جائیں۔

اللہ کی کتاب سے' اس لئے کہ اسی نے اپنے پیرووں پر یہ بار عظیم ڈالا ہے' اور ساتھ ہی اس کا یہ دعویٰ ہے' جس کی صداقت کا کوئی مسلمان انکار نہیں کر سکتا کہ وہ

تِبۡيَانًا لِّكُلِّ شَيۡءٍ ہے اس لئے یہ ممکن نہیں کہ دوسرے تمام امور میں تو اس نے ہماری رہنمائی کی ہو اور اسی مسئلے کو تاریکی میں چھوڑ دیا ہو جو سارے مسائل سے زیادہ اہم تھا اور جو تمام فرائض دینی کا صدر نشین ہے۔

اللہ کے رسولوں کا طریق کار اور اسوۂ اعمال سے' اس لئے ان کو پاکان خاص اور ان کے سچے پیروؤں کے سوا دنیا کسی ایسے انسان یا انسانی گروہ سے واقف ہی نہیں جس نے اس نصب العین کو اپنایا ہو۔

امکان کی بحث سے ادائے فرض کی بے نیازی

پہلے سوال کا جواب اللہ کی کتاب یہ دیتی ہے کہ مومن کے لئے اپنے اصل فریضے اور مقصد وجود کی خاطر جدوجہد ہر حال میں ضروری ہے اور اسے چاہئے کہ انجام کی پروا کئے بغیر اس میں ہر وقت لگا رہے۔ اسی طرح انبیائے کرام کا اسوہ بھی ٹھیک اسی بات کی گواہی دیتا ہے۔ چنانچہ قرآن کا ارشاد ہے کہ جو نبی بھی دنیا میں آیا اسے لوگوں کے سامنے آتے ہی یہ مطالبہ رکھ دینے کا حکم تھا کہ :۔

أَنِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ وَاجۡتَنِبُوا الطَّاغُوتَ (نحل۔ ۳۶)

لوگو! اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی پیروی سے بچو۔

.... أَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعۡبُدُونِ (انبیاء۔ ۲۵)

.... بلاشبہ میرے سوا کوئی معبود نہیں لہٰذا میری بندگی کرو۔

یہ چند حرفی مطالبہ دراصل اسی انقلابی مشن کا ایک اجمالی تعارف ہے جس کو اقامت دین کہتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ اس وقت "عبادت" "الہ" اور "طاغوت" کے جن محدود مفہوموں سے عام ذہن آشنا ہیں ان کی بنا پر اس بات میں کچھ غلو محسوس ہو' لیکن قرآن مجید نے شَرَعَ لَكُمۡ مِّنَ الدِّينِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوحًا" ۔ أَنۡ أَقِيمُوا الدِّينَ فرما کر اس خیال کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہنے دی ہے کیونکہ اس کے ان لفظوں سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو رہی ہے کہ نوحؑ ہوں یا ابراہیمؑ

موسیؑ ہوں یا عیسیؑ" محمدؐ ہوں یا کوئی اور' پیغمبر بلا استثناء ہر نبی کو اللہ کے نازل کئے ہوئے دین کی دعوت و اقامت ہی کا فریضہ سونپا گیا تھا۔ اس لئے فَاعْبُدُوا اللّٰہَ کا پورا اور صحیح مفہوم اس مفہوم کے سوا اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ جو اقیموا الدین کا ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ ان حضرات نے اپنے اس فریضے کو کس طرح ادا کیا؟ تو اس کے جواب میں کیا یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ جس مشن اور مقصد کو لے کر یہ اصحاب عزیمت تشریف لاتے رہے ہیں اس کے اظہار و اعلان میں' یا اس کی جدوجہد میں انہوں نے ایک لمحہ کی بھی دیر لگائی ہو گی؟ یا یہ کہ حالات کی سازگاریوں کا جائزہ لیا گیا ہو یا یہ کہ امکان و عدم امکان کی بحثوں میں الجھے ہوں گے۔ اور جب اس جائزے اور بحث سے کامیابی کے روشن امکانات سامنے آ گئے ہوں گے تب جا کر انہوں نے اپنی کشتیوں میں بادبان لگائے ہوں گے؟ ہو سکتا ہے کہ عقل مصلحت اندیش کا فتویٰ اس بارے میں کچھ اور ہو' مگر قرآن کا کہنا تو یہی ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی نہیں ہوئی۔ اس کے بخلاف ہر نبی نے اپنے اس فرض منصبی کی ادائیگی اس شان سے کی کہ نہ تو کبھی اس اہم کے کامیاب ہو جانے کی اس نے خدا سے گارنٹی طلب کی۔ نہ ایک لمحہ اس کا انجام سوچنے میں ضائع کیا۔ نہ اس کے امکان اور عدم امکان کا اس کے ذہن نے سوال اٹھایا' نہ حالات کی کوئی ناسازگاری ایک دن کے لئے اس سے اس آواز کو سینے میں دبا رکھنے کا مطالبہ کر سکی۔ بلکہ وہ اپنی بعثت کی ابتداء سے زندگی کے آخری لمحے تک اپنے اس فرض کو مسلسل بجا لاتا رہا۔ ان میں اگر کچھ ایسے تھے کہ ان کی دعوت الی الحق کامیاب ہو گئی اور وہ دنیا چھوڑنے سے پہلے سچے خدا پرستوں کا ایک گروہ پیدا کر کے دین اللہ کو غالب اور نافذ فرما گئے تو بے شمار ایسے بھی تھے جن کی آواز آخر تک بے حس دلوں کی چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر واپس ہوتی رہی' نوح علیہ السلام نے تقریباً ایک ہزار سال کے لیل و نہار' اس ادائے فرض میں صرف کر ڈالے۔ مگر اس طویل اور صبر آزما جدوجہد کا انجام زیادہ تر صرف ان گالیوں اور پتھروں کی شکل میں

نمودار ہوتا رہا جن سے ان کی "قوم" رات دن انہیں نوازتی رہتی تھی اور جب وہ اپنا فرض بجالا کر دنیا سے رخصت ہونے لگے تو ان کی دعوت قبول کرنے والوں کی تعداد گنتی کے چند افراد سے زیادہ نہ تھی۔ ابراہیم علیہ السلام بڑھاپے کی عمر تک بندگی رب کا پیغام سناتے پھرے اور اللہ کے دین کو قائم کرنے کی لگاتار کوششیں کرتے رہے۔ اس کوشش اور پیغام رسانی میں انہیں جیسی جیسی ابتلاؤں اور مصیبتوں سے گزرنا پڑا وہ شاید ہی اپنا نظیر رکھتی ہوں گی لیکن اس ساری تگ و دو اور پیہم قربانیوں کا ظاہریں جو ثمرہ نکلا وہ یہ تھا کہ ان کے اپنے اہل و عیال اور بعض قریبی اعزہ کے سوا مشکل ہی سے کوئی ان کی آواز پر لبیک کہنے والا تھا۔ حضرت لوطؑ شعیبؑ ہودؑ صالحؑ اور عیسیٰ علیہ السلام جیسے حضرات بھی موجود ہیں۔ جن کی تبلیغ و ہدایت کا انجام یہ ہوا کہ حق کا فدائی تو انہیں ایک نہ ملا۔ لیکن ان میں سے کسی کی گردن اڑا دی گئی اور کسی کے سر پر آرے چلا دیئے گئے۔ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ (آل عمران - ۲۱)

اور قریب آ کر دیکھئے' خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل اس واقعیت کا سب سے واضح اور مفصل ثبوت ہے ہر شخص جانتا ہے کہ آپؐ کی پیغمبرانہ ذمہ داریاں ہر نبی سے زیادہ تھیں۔ کیونکہ آپؐ کو جو دین قائم کرنے کے لئے دیا گیا تھا' وہ جامع ترین دین تھا۔ دوسری طرف اس دین کا مخاطب کسی ایک مخصوص قوم اور ملک کے بجائے پورا عالم انسانی تھا' اور اس عالم انسانی کا یہ حال تھا کہ اس کے ایک ایک گوشے میں طاغوت کا علم گڑا ہوا اور کفر و شرک کا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود آپؐ جب منصب نبوت پر سرفراز ہوتے ہیں تو حکم ہوتا ہے کہ :

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ (حجر - ۹۴)

جس تعلیم کا تمہیں حکم دیا گیا ہے اسے واشگاف پہنچا دو۔

آپ اس حکم کی تعمیل میں جیسا کہ چاہئے تھا' کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتے اور بغیر کسی لاگ لپیٹ کے اپنی دعوت لوگوں کے سامنے رکھ دیتے ہیں اور اسے فطری رفتار سے وسعت دیتے جاتے ہیں۔ چند سال بھی نہیں گزرنے پاتے کہ یہ پکار گھروں' گلیوں'

مجلسوں اور قرابتی حلقوں سے آگے بڑھ کر پہاڑ کی چوٹیوں سے بلند ہونے لگتی ہے' سننے والوں نے جس طرح اس پکار کا جواب دیا اس کو مکہ اور طائف کی گلیاں قیامت تک نہ بھولیں گی۔ لیکن خدا کے اس فرض شناس بندے کو ان باتوں کی ذرا بھی پروا نہیں ہوتی۔ اس کو اگر پروا ہوتی ہے تو صرف اس بات کی کہ جس کلمہ حق کو پہنچانے کا فریضہ مجھ پر عائد کیا گیا ہے اس کو پہنچا دینے میں کوئی کسر نہ رہ جائے یا پھر اس بات کی کہ بھٹکتی ہوئی انسانیت کی نجات اور بہبود جس صداقت پر منحصر ہے اس کو یہ سنتی اور مانتی کیوں نہیں؟ اس کی ساری تمنائیں بس اسی ایک تمنا میں آکر سمٹ گئی ہیں کہ کسی طرح میری بات دلوں میں اتر جائے اور جس دین کو اللہ نے میرے ذریعے نازل فرمایا ہے اس کے بندے اپنے کو اس کے حوالے کر دیں مگر اللہ تعالیٰ ہے کہ اس کو بار بار اور محبت کے ساتھ جھڑکتا ہے اور یہ حقیقت ذہن نشین کراتا ہے کہ تمہارا کام امر حق کو صرف پہنچا دینا اور کھول کھول کر بیان کر دینا ہے اس کے بعد اگر ایک شخص بھی اسے سن کر نہیں دیتا تو اس کی پروا نہ کرو (فان تولوا فانما علیک البلاغ المبین) اس لئے تم اپنی دعوت کا کام انجام سے بالکل بے پروا ہو کر بجا لاتے رہو' یہ نہ سوچو کہ کیا ہو گا ہو سکتا ہے کہ تم اپنی ہی آنکھوں سے اس دعوت کو کامیاب اور اس کے دشمنوں کو جاہ و برباد دیکھ لو' اور اس کا بھی امکان ہے کہ ایسا نہ ہو:

وَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِىْ نَعِدُهُمْ اَوْنَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ (یونس۔ ۴۶)

(اور تمہاری نگاہوں کے سامنے ہی اپنے انجام بد سے کسی قدر دوچار ہو لیں گے) یا (اس کے قبل ہی) ہم تم کو وفات دے دیں گے۔ کیونکہ ہماری ہی طرف تو ان کو پلٹ کر آنا ہے پھر یہ کہ ان کے سارے اعمال خدا کی نگاہ میں ہیں۔

یہ تاریخ انبیاء کے چند مشہور و معروف ابواب ہیں جو سوجھ بوجھ رکھنے والوں کی ہدایت اور سبق آموزی کے لئے قرآن حکیم میں بیان کئے گئے ہیں ان سرگزشتوں میں تبلیغ حق کا جو اصول سب سے زیادہ' اور جو نقش حقیقت میں سب سے زیادہ ابھرا ہوا

دکھائی دیتا ہے وہ یہی ہے کہ اللہ کے دین کی اقامت کے لئے کوئی شگون لینے کی ضرورت نہیں۔ نہ حالات کی ناسازگاریوں کا اندازہ لگانے کی کوئی گنجائش ہے اور نہ کامیابی کے امکانات ٹٹولنے کا کسی کو حق ہے۔ جو چیز ہمارا فریضہ زندگی قرار پا چکی وہ ہر حیثیت سے اس بات کی مستحق ہے کہ جب تک زندگی ہے اس کے لئے پوری پوری جدوجہد کرتے رہئے۔ وہ فرض دراصل دل سے فرض مانا ہی نہیں گیا جس کو مشکلات کے اندیشے سردخانے میں ڈلوا دیں اور جو امکان و عدم امکان کی بحثوں کا زخم کھا سکے۔
اگر دعوت توحید اور اقامت دین کا کام شروع کرنے سے پہلے امکانات کا جائزہ لینا صحیح ہوتا تو یقین جانئے کہ انبیاء کی ایک بڑی تعداد اپنے مشن کا نام بھی زبان پر نہ لاتی۔ اس کے لئے عملی جدوجہد کا تو کیا سوال پیدا ہوتا؟ کیونکہ انبیاء علیہم السلام اقامت دین کا مشن لے کر دنیا میں عموماً بھیجے ہی اس وقت جاتے تھے جب اس کام کے لئے حالات کی ناسازگاریاں اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی ہوتی تھیں۔ اور جب کلمہ حق کا نشوونما بظاہر ناممکن سے ناممکن تر ہو چکا ہوتا تھا۔ لیکن حالات کی ان شدید ناسازگاریوں اور امکان کامیابی کی بظاہر ان انتہائی کم یابیوں کے باوجود جن سے ہم اپنے زمانے کی ناسازگاریوں اور دقتوں کا کوئی مقابلہ ہی نہیں کر سکتے۔ انہوں نے بلا توقف کشتی سمندر میں ڈال دی' اور ذرا نہ سوچا کہ ساحل کہاں اور کدھر ہے؟ موسم پر سکون ہے یا طوفانی؟ ہوا موافق ہے یا مخالف؟ کشتی کھینے والے بازوؤں میں توانائی کتنی ہے؟ سمندر پیدا کنار ہے یا ناپیدا کنار؟ راستہ صاف ہے یا پانی کے اندر چٹانیں ہیں؟ اس طرح کا کوئی ایک بھی سوال نہ تھا' جس نے ان کے ذہنوں میں کبھی بار پایا ہو۔
پھر اب وہ کن لوگوں کا اسوہ ہے جو اس معاملہ میں ہماری رہنمائی کا حق رکھتا ہے؟ اور جس کی سند پر ہم مشکلوں اور ناسازگاریوں کے پیش نظر اپنے مقصد وجود سے عارضی طور پر بھی "تائب" ہو جا سکتے ہیں؟ انبیاء علیہم السلام کا تو جو اسوہ ہے' آپ نے دیکھا وہ اس طرح کی کوئی رعایت ہمیں دینے کے لئے بالکل تیار نہیں۔ ہاں اگر ہم نے انبیاء علیہم السلام کی سرگزشتوں کو عملاً" خدانخواستہ' مشرکین عرب کی طرح "اساطیر

الاولین" کی حیثیت دے رکھی ہے' اور انہیں ایسی گذری ہوئی داستانیں سمجھ بیٹھے ہیں جن کو ہمارے افکار و اعمال کا رخ متعین کرنے میں کوئی دخل ہی حاصل نہیں' تب تو بات ہی دوسری ہے لیکن اگر صورت واقعہ یہ نہیں ہے اور ہماری بدبختیوں نے ابھی تک ہمیں نَسُوا اللّٰهَ فَاَنسَاهُمْ اَنفُسَهُمْ کی حد تک نہیں گرایا گیا ہے بلکہ ہم ان سرگذشتوں کی اسی ہدایت کا مینار اور بصیرت کا سرچشمہ یقین کرتے ہیں جس طرح قرآن بتاتا ہے تو ان کے ورق ورق سے ہمیں یہ ہی ہدایت ملے گی کہ جو چیز تمہارا فریضہ حیات قرار پا چکی اس کی خاطر جدوجہد تم کسی حال میں بھی نہیں چھوڑ سکتے۔

ناسازگاری احوال کا واقعی تقاضا

کہا جائے گا کہ حالات بہر حال اپنا ایک وزن رکھتے ہیں اور انسان کے فکر و عمل پر لازماً" اثر انداز ہوتے ہیں اس لئے عقل یہ کس طرح تسلیم کرلے کہ دعوت حق کے سلسلے میں وہ کسی اعتنا کے قابل ہیں ہی نہیں؟ بلاشبہ یہ ایک صحیح اور معقول بات ہے اور اس کی صحت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اوپر کی سطروں میں یہ بات کب اور کہاں کہی گئی ہے کہ حالات کا دعوت حق کی جدوجہد پر اثر بالکل پڑتا ہی نہیں؟ ان میں تو جو بات کہی گئی ہے وہ صرف یہ ہے کہ حالات کی ناسازگاریاں اس جدوجہد کو ملتوی یا منسوخ نہیں کرا سکتیں۔ اب رہا یہ سوال کہ پھر وہ اس جدوجہد پر کس حیثیت سے اثر انداز ہوتی ہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ جتنی ہی زیادہ سخت و شدید ہوتی ہیں اس جدوجہد کو اتنا ہی زیادہ ضروری بنا دیتی ہیں؟ .... یہ جواب نقل اور عقل دونوں ہی کا ہے۔

(ا) چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر نبی عموماً" ایسے ہی وقت میں اس کام پر مامور کیا جاتا ہے جب کہ حق کی روشنی اس زمین سے بالکل ہی مفقود ہو چکی ہوتی تھی اور کفرو مادیت کے گھٹا ٹوپ اندھیرے اس کی دعوت کا امکان کامیابی دور دور تک بھی کہیں نظر نہ آتا تھا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ جدوجہد ایسے ہی ماحول سے زیادہ مانوس ہے

اور حق تعالیٰ کی مرضی اسی بات میں ہے کہ اس طرح کے تاریک حالات میں صداقت کا چراغ ضرور جلایا جائے اور اس کے بندے اس کے دین کے لئے جو کچھ بھی کر سکتے ہوں اس سے ہرگز دریغ نہ کریں اور یہ غالباً اس کے لئے اس کی رافت و رحمت کو اس گہری تاریکی کا اور بڑھ جانا گوارا نہیں رہ جاتا۔

(۲) ٹھیک یہی بات عقل بھی کہتی ہے وہ کہتی ہے کہ جب اللہ کا دین نوع انسانی کے لئے ہدایت اور روشنی ہے تو جس جگہ کا انسان جتنا زیادہ گمراہی اور تیرگی کا شکار ہو گا اس جگہ اس ہدایت اور روشنی کی ضرورت بھی اتنی ہی زیادہ ہو گی۔ دعوت حق کے لئے سخت و شدید ناسازگاریوں کے معنی یہ ہیں کہ حق سے بے التفاتی اور دوری حد سے آگے بڑھ چکی ہے اور لوگ اندھیارے سے محبت کرنے لگے ہیں اس لئے ان ناسازگاریوں کا واقعی تقاضا صرف یہی ہو گا کہ جو لوگ انسانیت کو نور حق دکھانے پر مامور ہیں۔ وہ خاموشی کو اپنے اوپر حرام کر لیں اور اونچی سی آواز میں انہیں اپنا پیغام سنائیں۔ جو ہلاکت کی راہ پر اندھا دھند بھاگے چلے جا رہے ہیں اگر دوسری طرف کے حالات میں ان کے لئے کچھ سہل انگاری کی گنجائش مان بھی لی جائے تو کم از کم اس طرح کی غیر معمولی حق بیزاری کی حالت میں ایسی کوئی گنجائش قطعاً نہیں مانی جا سکتی حفظان صحت کا کوئی محکمہ اگر وبا پھوٹ پڑنے پر بھی خواب خرگوش سے نہ جاگے تو اس کی فرض شناسی کی داد کون دے سکتا ہے؟

عقل اور نقل دونوں کو اس متفقہ جواب کے بعد یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ جس زمانہ میں لوگ حق سے جتنا ہی زیادہ بے گانہ ہوں' دہریت اور مادیت کی جتنی ہی زیادہ گرم بازاری ہو' طاغوت کی حکمرانی جتنی ہی زیادہ وسیع' ہمہ گیر' اور پائیدار ہو حق کے علمبرداروں پر دین اللہ کی اقامت کا فریضہ اتنا ہی زیادہ اہم اور ضروری ہو جاتا ہے اس لئے اگر موجودہ حالات کے بارے میں یہ اندازہ صحیح ہے کہ اس وقت دنیا حق سے بری طرح متنفر اور برگشتہ ہو رہی ہے اور اسے اس کا نام سننا بھی گوارا نہیں تو یہ صورت حال اقامت دین کی جدوجہد میں کسی رعایت کی موجب بالکل نہیں ہوتی بلکہ یہ مطالبہ

اس بات کا کرتی ہے کہ اس مہم کو معمول سے زیادہ جوش' سرگرمی اور انہماک سے انجام دیا جائے۔

ایک اور پہلو سے دیکھئے تو معاملہ کی اہمیت اور بھی آگے بڑھی ہوئی معلوم ہو گی۔ یعنی بات صرف اتنی ہی رہ جائے گی کہ اقامت دین کی جدوجہد امکان و عدم امکان کی بحث سے بالاتر ہے اور اس کو ہر وقت' ہر ماحول اور ہر حالت میں جاری رکھنا چاہئے۔ بلکہ اس حد کو پہنچ جائے گی کہ اگر حالات کے اندازے اس جدوجہد کی ناکامی کا یقین دلا رہے ہوں۔ حتیٰ کہ بالفرض اگر کوئی اپنی آنکھوں سے نوشتہ الٰہی میں اس ناکامی کو مقدر دیکھ لے تو بھی اس کے لئے اس میں لگے رہے بغیر چارہ نہیں۔ کیونکہ یہ دنیا کی عام تحریکوں اور اسکیموں جیسی کوئی تحریک اور اسکیم نہیں ہے۔ کہ اگر اس کی کامیابی کے ذرائع مفقود اور امکانات ناپید نظر آئیں تو اس سے دست کش ہو جانے میں بھی کوئی حرج نہ ہو۔ نہ یہ مسلمانوں کے سرپر کوئی اوپر سے چپکی ہوئی ذمے داری ہے کہ چاہا تو قبول کر لیا ورنہ ٹھکرا دیا۔ اور اگر قبول بھی کر لیا تو پھر جب چاہا اس کو اپنے پروگرام سے خارج کر دیا اس کے برعکس ایک شخص کے مسلمان ہونے کے معنی ہی یہ ہیں کہ اس نے اس دین کی اقامت کے لئے اپنے کو وقف کر دیا ہے۔ اللہ پر ایمان لانے اور حق سے محبت کرنے کا فطری مطالبہ ہی یہ ہے کہ جو چیزیں خدا کو محبوب ہوں اور جو باتیں حق ہوں انسان ان کو خود بھی اپنائے اور انہی کو اپنے گردوپیش بھی زندہ اور کارفرما دیکھنے کا دل سے آرزو مند ہو اور انہیں کارفرما بنا دینے کے لئے ہمہ دم کوشاں رہے۔ اسی طرح ہر اس چیز کو مٹا دینے کے لئے بے قرار اور مصروف تگ و تاز نظر آئے جو خدا کو ناپسند اور خلاف حق ہوں۔ چنانچہ اوپر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے یہ حقیقت بالکل واضح کی جا چکی ہے کہ جس طرح آگ اور پانی کا اتحاد ممکن نہیں اسی طرح ایمان اور منکرات میں مصالحت ممکن نہیں۔ لہٰذا منکرات کو مٹانے اور ان کی جگہ معروفات کو قائم کرنے کی جدوجہد' اقامت دین کی جدوجہد ہی کا دوسرا نام ہے' اسلام سے علیحدہ اور اس پر زائد کوئی چیز نہیں ہے۔ بلکہ اس کی اصل روح

اور اس کی حرکت قلب ہے اگر یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی جاندار زندہ تو ہو مگر اس کے قلب میں حرکت نہ ہو تو اسی طرح یہ بھی تصور نہیں کیا جا سکتا کہ ایک شخص ہو تو مومن مگر اقامت حق کی تڑپ نے اس کے دل و دماغ خالی ہوں اور عملی جدوجہد سے اس کے دست و بازو یکسر نا آشنا اس تڑپ سے خالی اور اس جدوجہد سے نا آشنا ہونا کوئی معمولی بات نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب دراصل اپنے مقصد حیات ہی سے کنارہ کش ہو جانے کے ہیں جس کے بعد ظاہر ہے کہ مسلمان کا وجود ہی بے معنی ہو جاتا ہے چنانچہ اہل کتاب کے متعلق جنہوں نے کہ اپنے اس مقصد زندگی کو فراموش کر رکھا تھا قرآن نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ جب تم توراۃ اور انجیل کو قائم نہ کرو تم کسی اصل پر نہیں ہو اور تمہارا ملی وجود ایک وجود موہوم کے سوا کچھ نہیں۔ (لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَا اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ) اس لئے یہ کہنا کہ اس زمانے میں اقامت دین نا ممکن ہے گویا یہ کہنا ہے کہ اس زمانے میں مسلمان ہونا ممکن نہیں ہے اور حالات زمانہ کی ناسازگاری کے پیش نظر اقامت دین کی جدوجہد کو ترک کرنے کے معنی یہ ہیں کہ خود اسلام ہی سے دست بردار ہو جانے کو بھی غلط نہ سمجھا جائے۔

غیرت کا سبق

یہ بات کہ جو چیز زندگی کا اصل فریضہ قرار پا چکی ہو وہ امکان اور عدم امکان کی بحث سے بالا تر ہو جاتی ہے کچھ اسلام اور مسلمان ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ ایک عام اور مسلم حقیقت ہے۔ چنانچہ انبیاء اور ان کے سچے پیروؤں نے اس مطالبہ کو پورا کر دکھایا ہے تو کافروں اور دہریوں کے یہاں بھی اس مطالبے کو ایک واجب التسلیم مطالبے ہی کی حیثیت حاصل ہے اور وہ بھی نصب العین کے معنی یہی سمجھتے ہیں کہ نصب العین وہ چیز ہے جو آنکھوں سے کبھی او جھل نہ ہو۔ جو زندگی کے میدان میں آنے کے لئے ایسے حالات کی اجازت کی محتاج نہ ہو جو ماحول کی سازگاریوں کی خواہش

مند تو ہو مگر ناسازگاریوں سے خوف بھی نہ کھاتی ہو اور جس کی خاطر جدوجہد میں اگر زندگی ختم نہ کی جا سکے تو وہ بالکل رائیگاں ہے چنانچہ ان کی تاریخ اس بات کی عملی شہادتوں سے بھری پڑی ہے۔

مارکس کے پیروؤں ہی کو لے لیجئے اس کے چند مخصوص نظریات تھے جن پر وہ ایمان لائے اور انہی نظریات کی اقامت کو انہوں نے انسانی مسائل کا صحیح حل سمجھا۔ اس لئے اسی کام کو انہوں نے اپنی زندگیوں کا نصب العین بنا لیا اور اس کے لئے پوری یکسوئی اور کامل انہماک سے سعی وجہد شروع کر دی۔ یہ سعی و جہد سب سے زیادہ زور و قوت سے اس مملکت میں شروع کی گئی جس میں وقت کی سب سے مستبد حکومت قائم تھی۔ جہاں زار نکولس کی شخصی آمریت اور قہاریت کے خلاف سانس لینا بھی بظاہر ممکن نہ تھا مگر اشتراکی اصولوں پر معاشرے اور حکومت کی تنظیم کو اپنا مقصد زندگی قرار دینے والوں نے ان دشواریوں' ناسازگاریوں اور مصیبتوں کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں جو اس جدوجہد کے پردے میں چھپی انہیں گھور رہی تھی جب زار کے کانوں تک ان کی سرگرمیوں کی اطلاع پہنچی تو وہ ظلم اور انتقام کے تمام اسلحوں سے مسلح ہو کر پوری خشمناکی کے ساتھ ان پر ٹوٹ پڑا۔ کتنوں ہی کو تو اس نے موت کے گھاٹ اتار دیا' جو بچ رہے ان کو سائبیریا کے برفستانی جہنم میں جھونک دیا۔ ظلم اور ایذا دہی کی کوئی ممکن صورت ایسی نہ تھی جس سے اشتراکیت کے ان "مومنوں" کو سابقہ نہ پڑا ہو۔ سالہا سال تک دارو گیر کا یہی ہنگامہ بپا رہا۔ مگر کوئی بڑی سے بڑی مصیبت اور ناسازگاری بھی ان کے عزم کو نہ ہلا سکی اور اشتراکیت کا عشق آلام و مصائب کے طوفانوں سے انہیں برابر لڑاتا رہا اور منزل مقصود کی طرف ان کے قدم لگاتار بڑھواتا ہی رہا۔

انہی اشتراکیوں میں آگے چل کر جب کہ وہ زار کا تخت سلطنت الٹ کر اپنا اشتراکی نظام قائم کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے باہم اختلاف ہو گیا۔ لینن کی وفات کے بعد سیاست کی باگ ڈور اسٹالن کے ہاتھوں میں آ گئی جس نے آہستہ آہستہ اشتراکی نظام کو بین الاقوامیت کی سطح سے ہٹا کر قومی اشتراکیت کی سطح پر لانا شروع کیا۔ اس کی اس

پالیسی سے جو اصول اشتراکیت سے فی الواقع بالکل ہٹی ہوئی پالیسی تھی اور دراصل مارکسی نظریات کے ساتھ کھلی ہوئی غداری تھی ٹراٹسکی نے اختلاف کیا' اور اشتراکیت کی اصلی روح اور خالص مارکسیت کے قائم کرنے اور قائم رکھنے پر زور دیا۔ اسٹالن نے نہ صرف یہ کہ اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا بلکہ اس کو اس جرم کی پاداش میں حکومتی اوارے سے ہی نکال دیا۔ خفیہ پولیس نے اس پر اور اس کے ہم خیالوں پر کڑی نگرانی عائد کر دی اور اس کی زبان پر تالے چڑھا دیئے گئے۔ مگر وہ جن اصولوں پر ایمان رکھتا تھا اور جن کے نفاذ میں اس کو دنیا کی فلاح نظر آ رہی تھی ان کی تبلیغ سے وہ باز نہ رہا۔ آخر جلا وطن کر دیا گیا۔ امریکہ پہنچا اور وہاں سے اپنے مشن کو پھیلانے اور اپنے نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ اس کے دشمن وہاں بھی پہنچے' اور ایک روز سازشوں کے ذریعے انہوں نے اس کے سامنے موت کا پیالہ پیش کر دیا' جسے مارکسیت کے اس "مومن قانت" نے نہایت صبر و سکون کے ساتھ قبول کر لیا اور اپنے مقصد و نصب العین پر قربان ہو گیا۔

یہ تو کچھ پرانی باتیں ہیں' ذرا قریب کی تاریخ دیکھئے یہ جاپانی اور جرمن قومیں جو زخموں سے چور آپ کے سامنے پڑی ہیں ان کے واقعات سنئے۔ ان کے رہنماؤں نے ان کے سامنے ایک نصب العین رکھا۔ ان پر ایمان لائیں اور پھر اس کے حصول کے لئے سرگرم عمل ہو جائیں۔ حریف قوموں نے روکا۔ انہوں نے اس روک کو تلوار کی نوک سے دور کرنے کی ٹھان لی۔ لڑائی کا میدان گرم ہو گیا اور یہ دونوں قومیں اپنے اپنے دائروں میں سیلاب کی طرح آگے بڑھنے لگیں اور چند ہفتوں کے اندر اندر ہزاروں مربع میل علاقوں پر قابض ہو گئیں۔ مگر قسمت نے یکایک پلٹا کھایا تو پھر اسی تیزی سے وہ پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گئیں اور تباہیوں کی ان پر بری طرح بارش ہونے لگی۔ مگر اپنے نصب العین کا یہ عشق تھا کہ ان کے نوجوان موت کو منہ کھولے ہوئے دیکھتے اور اس میں کود جاتے۔ ہوائی جہازوں سے چھلانگ لگاتے اور بم لے کر سیدھے دشمن کے جنگی جہازوں کی چمنیوں میں جا پڑتے۔ بموں سے لدا ہوا ہوائی جہاز لے کر ان

کے جہازوں پر جا گرتے۔ اور اس طرح دنیا کی جنگی لغت میں "خودکش ہوائی جہاز" اور "کفن بردوش" طیارے کی اصطلاحوں کا اضافہ کر گئے۔ پھر آخر میں جب قدرت نے ان کو اپنی آرزوؤں میں قطعی حد تک ناکام بنادیا تو وہ اس عقیدے کے ساتھ "ہرکیری" (خودکشی) کرنے لگے کہ مرنے کے بعد دیوتا بن کر اپنی قوم کی خدمت اور اپنے مقصد کی خاطر جنگ کریں گے۔ اور ان کی عورتیں اپنے نوزائیدہ بچوں کی پرورش اس جذبے سے کرنے لگیں کہ یہ بڑے ہو کر دشمنوں سے اپنی قومی عظمت کی تباہی کا انتقام لیں گے۔

یہ ان لوگوں کے نظریئے اور کارنامے ہیں جن کا کوئی مستقبل نہیں۔ جن کی قربانیوں کا کوئی ثمرہ مرنے کے بعد ان کو .... ملنے والا نہیں۔ اور جن کے سامنے اگر کچھ ہے تو صرف اسی دنیا کے رذیل مقاصد ہیں۔ کیا ان واقعات اور حقائق میں ہمارے لئے عبرت کا کوئی درس اور غیرت کا کوئی پیام نہیں؟ کیا رضائے الٰہی اور سعادت اخروی میں اتنی بھی گہرائی نہیں جتنی کہ ان چند روزہ مادی مقاصد میں ہے؟ کیا ایمان باللہ میں اتنی بھی حرارت نہیں ہو سکتی جتنی کہ ایمان بالطاغوت میں دیکھی جارہی ہے۔ کیا حق کی شہادت میں اتنی بھی جرات نہیں دکھائی جانی چاہئے جتنی کہ باطل کی شہادت میں اس کے ماننے والے دکھایا کرتے ہیں؟ اور کیا اپنے فریضہ حیات کو اتنی اہمیت بھی اہل اسلام دینے کو تیار نہیں جتنی کہ اہل کفر دے رہے ہیں؟ انبیائے کرام کے واقعات کو نفس حیلہ گر پیغمبرانہ جوشِ تبلیغ اور روح کی غیبی تائید کا نتیجہ قرار دے کر ٹال سکتا ہے۔ مگر اہلِ کفر و ضلال کی ان سرفروشیوں کے پیچھے کسی معجزے اور غیبی تائید کا نتیجہ قرار دے کر ٹال سکتا ہے مگر اہل کفر و ضلال کی ان سرفروشیوں کے پیچھے کس معجزے اور غیبی تائید کا سراغ بتایا جا سکے گا؟ کاش ہم .... امکان و عدم امکان کی بحثیں چھیڑتے وقت باطل پرستوں ہی کے اعمال و اخلاق پر ایک نظر ڈال لیتے اور انہی سے مقصد زندگی کا حق ادا کرنا سیکھ لیتے۔ افسوس یہ منظر بھی کتنا عبرت ناک ہے۔ جن کی نظر اسی عالم آب و گِل تک ہے وہ تو ادائے فرض میں فکر انجام سے

اتنے بلند ہوں اور وہ جن کا دعویٰ ہے کہ ہماری نماز اور ہماری قربانی' ہماری زندگی اور ہماری موت سب کچھ صرف اللہ کے لئے ہے' ناکامی کے اندیشے ڈھونڈنے میں مصروف ہیں۔ جو نقشِ حقیقت ایک اندھا طہ بھی ہاتھوں سے ٹٹول کر معلوم کر لیتا ہے وہ ایمان کی روشنی رکھنے والی آنکھوں کو ذرا بھائی نہیں دیتا۔

جذباتیت کا بے بنیاد طعنہ

اگرچہ اس تقریر کے بعد یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ ادائے فرض کے سلسلے میں امکان کی بحث پیدا ہی نہیں ہوتی۔ اور ایمان کی غیرت اس کے تصور تک کو برداشت نہیں کر سکتی۔ نیز ایمان کی غیرت تو الگ رہی کوئی خوددار اور باحمیت کفر بھی اس کا روادار نہیں ہو سکتا۔ مگر اس کے باوجود ہمیں اندیشہ ہے کہ یہ بات اس وقت کے مصلحت پرست اور عافیت پسند دماغوں میں شاید ہی گھس پائے گی اور ہرگز خلاف توقع نہ ہو گا اگر دانش و تدبر کے کتنے ہی دعویدار اک خاص بزرگانہ شان سے بول اٹھیں کہ یہ سب جذباتی باتیں ہیں جن کا دنیائے عمل سے کوئی تعلق نہیں۔ "اہل دانش" کے اس ریمارک کو بڑی خوشی کے ساتھ قبول کر لیا جاتا۔ اگر قبول کرنے کی کچھ بھی گنجائش ہوتی' کیونکہ ذمے داری کا ایسا بھاری بوجھ اٹھانے اور خطروں سے اس طرح روندی ہوئی راہ اختیار کرنے کا خواہ مخواہ کسی کو کوئی شوق نہیں ہو سکتا مگر دشواری یہ ہے کہ اس رائے کے قبول کرنے سے ہماری مشکل حل نہیں ہوتی بلکہ اس میں مزید گرہیں پڑ جاتی ہیں کیونکہ پھر وہی عقل جس کی دہائی دی جا رہی ہے پکار کر پوچھتی ہے کہ ایسا دین قبول ہی کیوں کیا جائے جو بار بار اور کھلم کھلا اس جذباتی طرز عمل کی تلقین کرتا ہو۔ اگر ایک شخص کسی دین کی سچائی تسلیم کرتا اور اس کے اتباع کا عہد کرتا ہے تو اس کو لازم ہے کہ دہکتے ہوئے الاؤ کے اندر بھی کود پڑنے میں کوئی پس و پیش نہ کرے اگر اس کے دین کا بالفرض اس سے یہ مطالبہ ہو' لیکن اگر وہ اس کے مطالبات کو سن کر ٹال دیتا ہے اور انہیں جذباتی .... دوسرے لفظوں میں ناقابل

عمل اور غیر معقول خیال کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ فی الواقع اس کا اس پر ایمان ہی نہیں' اس کا ایمان اگر ہے تو اپنی عقل و فہم پر ہے اس لئے ایمان داری کا تقاضا یہ ہے کہ اس دین کے نام سے اصول و مسائل پر بحث کرنے سے پہلے وہ اپنی پوزیشن کی تعیین کرے۔

لیکن کیا واقعتاً" یہ بات جذباتی ہی ہے اور اس مطالبے کی بنیاد نرے جذبات ہی پر ہے؟ نیز کیا جذبات کی ہماری عملی زندگی میں کوئی اہمیت اور ضرورت بالکل ہے ہی نہیں؟ جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے اس کے بارے میں کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ پچھلے صفحات میں جو بحثیں کی جا چکی ہیں ان میں اس خیال کی تردید کا پورا پورا مواد موجود ہے۔ رہ گیا دوسرا سوال تو تھوڑے سے غور و فکر کے بعد اس کا جواب بھی آسانی سے سمجھ میں آجائے گا۔ جائزہ لے کر دیکھئے کہ دنیا میں بڑی بڑی مہمیں کس طرح سر کی جایا کرتی ہیں؟ آیا محض نظری فلسفوں ہی سے یا جذبات کی مدد بھی ضروری ہوتی ہے؟ یہ جائزہ آپ کو یقیناً" اس نتیجے پر پہنچائے گا کہ کسی بھی بڑے کام کی کامیابی کا انحصار عقل' اور جذبات دونوں پر ہوتا ہے اس میں جس طرح عقل و تدبر کے ٹھنڈے فلسفوں سے بے اعتنائی نہیں برتی جا سکتی۔ اسی طرح جذبات کی گرم لہروں سے بھی بے نیازی ممکن نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ دونوں کے وظائف الگ الگ ہو سکتے ہیں اس لئے اگر وہ کام جو عقل کے کرنے کا ہے جذبات کے ہاتھوں میں دے دیا گیا تو اس کا نتیجہ لازماً" ناکامی ہی کی شکل میں نمودار ہو گا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ کسی مقصد کی تعیین تو صرف عقل ہی کرتی ہے یہ عقل ہی کا کام ہے کہ پوری پوری چھان بین کرکے بتائے کہ انسان کو کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے پھر یہ کہ کرنے کے کاموں میں سے کون سے کام صرف بہتر ہیں اور کون سے ضروری؟ نیز جو ضروری ہیں ان کے مراتب کیا ہیں۔ ان میں سے کس کی حیثیت بنیادی قسم کی ہے اور کس کی غیر بنیادی نوعیت کی؟ جب اس بارے میں وہ اپنا فیصلہ دے دے تو پھر انسان پر یہ لازم ہو جاتا ہے کہ وہ مختلف کاموں کو اپنے

پروگرام میں وہی جگہ دے جو اس نے دینے کو کہا ہو اور اس طرح صرف اسی چیز کو اپنے لئے ضروری یا بنیادی اہمیت کی مالک ٹھیرائے جسے اس کی عقل ایسا ٹھیرا چکی ہو اور اس مسئلہ میں اپنے جذبات کو چوں کرنے کی بھی اجازت نہ دے۔ ورنہ اسے بجا طور پر جذباتی اور احمق کہا جائے گا مگر جب عقل اپنا فریضہ انجام دے چکی اور گہرے سوچ بچار کے بعد ایک شے کو ضروری قرار دے چکی تو اب وہ موقع آجاتا ہے جہاں جذبات کی شرکت اور ضرورت ناگزیر ہو جاتی ہے کیونکہ آگے عقل محض کے بس کا یہ کام ہے ہی نہیں کہ وہ اس منزل مقصود کی طرف قدموں کو مطلوبہ رفتار سے بڑھا سکے یہ کام وہ اسی وقت انجام دے سکتی ہے جب جذبات کی معاونت بھی حاصل کرلے۔ بلکہ زیادہ صحیح بات تو یہ ہے کہ یہاں عملی اہمیت کے لحاظ سے جذبات عقل پر بھی مقدم ہو جاتے ہیں۔ معاملے کے یہاں تک پہنچ چکنے کے بعد اب دراصل یہ جذبات ہی ہوتے ہیں جو دلوں میں عمل کا ولولہ اور قدموں میں حرکت و اقدام کا وہ جوش پیدا کرتے ہیں جن کے بغیر منزل تک رسائی ناممکن ہے۔ یہ جذبات اگر آمادہ کار نہ ہوں تو عمل کی قوتیں سوئی پڑی رہ جائیں گی اور مقصد کی بڑی سے بڑی جاذبیت بھی انہیں جھنجھوڑ کر بیدار نہ کر سکے گی۔ یوں کہئے کہ عقل صرف سمت سفر متعین کرتی اور انجن اور پٹڑی تیار کرتی ہے مگر اس انجن کو حرکت دینے والی اور منزل مقصود تک اسے دوڑا دینے والی اسٹیم یہی جذبات مہیا کرتے ہیں۔ جذبات نے انسانی زندگی کی تعمیر میں اور اہم مقاصد کے حصول میں یہ مقام غاصبانہ طور پر حاصل نہیں کیا ہے بلکہ ان کا یہ ایک فطری حق ہے اور عقل نے اس حق کو تسلیم کرنے سے کبھی انکار نہیں کیا ہے اس لئے جس طرح مقاصد کی تعیین میں جذبات سے کام نہ لینا عقلیت ہے۔ اسی طرح ان مقاصد کے حصول میں جذبات سے بیش از بیش کام لینا بھی عقلیت ہی ہے جذباتیت نہیں ہے۔

عقل اور جذبات کے ان الگ الگ وظائف کو سامنے رکھئے اور پھر انصاف سے فیصلہ کیجئے کہ جب اس نے پورے اطمینان کے ساتھ اسلام کو اللہ کا واجب الاتباع دین

مان لیا تو اس کے مطالبات کی تکمیل میں جذبات کی پوری قوت لگا دینا آیا جذباتیت ہے یا عقلیت؟ کوئی شبہ نہیں کہ اس کا فیصلہ یہی ہو گا کہ یہ خالص عقلیت ہے۔ لہٰذا اسلام پر ایمان رکھنے اور اقامت دین کو اپنا فریضہ حیات تسلیم کرنے کے باوجود اس کے لئے اٹھ کھڑے ہونے سے لیت و لعل کرنا دانش مندی نہیں بلکہ دانش فروشی ہے۔ عقل و تدبر کا نام لے کر عقلیت کو رسوا کرنا ہے۔

غلط روی کے اسباب

بحث کے ان سارے پہلوؤں کے روشن ہو جانے کے بعد ذہن میں قدرتاً ایک بڑا نازک سوال ابھرنے لگتا ہے اور وہ یہ کہ جب بات اتنی واضح تھی تو پھر لوگ حالات کی سازگاریوں اور ناسازگاریوں کی بحث میں کیوں جا الجھے؟ اور امکان و عدم امکان کے اس مسئلے نے ان کے ذہنوں میں کہاں سے بار پا لیا۔ جس کے نتیجے میں وہ اپنے فریضہ حیات سے یوں بے تعلق ہو کر رہ گئے۔ حقیقت کا علم تو اللہ ہی کے پاس ہے۔ مگر جہاں تک انسانی فہم کی رسائی کا تعلق ہے یہ غلط روی بظاہر ان دونوں باتوں کو نہ سمجھ پانے کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔

ایک تو یہ کہ اقامت دین کا فریضہ حیات ہونے' اور پھر اس فریضے سے عہدہ برآ ہونے کے اصل معنی کیا ہیں؟

دوسری یہ کہ اس فریضے کی خاطر کی جانے والی جدوجہد میں کامیابی کا مفہوم کیا ہے؟

اس لئے اگر ان دونوں باتوں کو اچھی طرح سے سمجھ لیا جائے اور ذہن کو ٹھیک اس سانچے میں ڈھال لیا جائے جو قرآن عطا کرتا ہے تو پھر نہ حالات کی ناسازگاریوں کا کوئی سوال باقی رہے گا' نہ امکان اور عدم امکان کی بحث پیدا ہو گی۔

مومن کی اصل ذمے داری

جب یہ کہا جاتا ہے کہ دین کی اقامت اہل ایمان پر فرض ہے تو اس کا مطلب غالباً" یہ لے لیا جاتا ہے کہ زمین پر اسلامی نظام زندگی کو بالفعل قائم اور نافذ کردینے کو ہمارا فرض کہا جا رہا ہے حالانکہ یہ صریح غلط فہمی ہے ہم پر تو جو چیز فرض ہے اور جس کی ہم سے اللہ تعالیٰ کے یہاں پرسش ہوگی وہ دین کو بالفعل قائم کر دینا نہیں ہے۔ بلکہ اس کو قائم کر دینے کی اپنی پوری طاقت سے جدوجہد کرنا ہے جس نے یہ کرلیا وہ اپنے فرض کو پورا کر گیا' اگرچہ ایک شخص نے بھی اس کی بات نہ مانی ہو' اور ایک ذرہ زمین پر بھی وہ دین حق کو قائم نہ کر پایا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان پر اتنا ہی بوجھ ڈالا ہے جتنا وہ اٹھا سکتا ہے (لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْساً اِلَّا وُسْعَهَا) اس نے کسی پر کوئی ایسی ذمے داری ڈالی ہی نہیں ہے جو اس کی فطری صلاحیتوں اور قوتوں سے زیادہ ہو۔ مثلاً" اس نے ہم سے مطالبہ کیا ہے کہ ہم اس کا تقویٰ اختیار کریں۔ مگر اس کا یہ مطالبہ ہماری واقعی سکت سے بڑھ کر نہیں ہے بلکہ اسی حد تک ہے کہ ہماری خلقی استطاعت کے بس میں ہو۔ چنانچہ وہ فرماتا ہے :

اِتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (التغابن ـ ۱۶)

اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ جس قدر تم کر سکتے ہو۔

یا مثلاً" مسلمانوں پر فرض کیا گیا ہے کہ وہ اعدائے دین کا مقابلہ کرنے اور ان کا زور توڑ ڈالنے کے لئے تیار رہیں مگر اس کے لئے ان سے یہ مطالبہ نہیں کیا گیا ہے کہ جس طرح بھی ہو دشمنوں کی قوت جنگ کے برابر قوت لازماً" فراہم کریں۔ بلکہ صرف یہ کہا گیا ہے اور اتنا ہی ان پر واجب کیا گیا ہے کہ:

اَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ الخ (انفال)

دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے لئے اتنی قوت تیار رکھو جتنی کہ کر سکتے ہو۔

اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جب لوگ اطاعت کی بیعت کرتے تو آپ

ان کے الفاظ بیعت میں خود اپنی طرف سے بحد استطاعت کی قید بڑھا دیتے' چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں :-

كُنَّا نُبَايِعُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ يَقُوْلُ لَنَا فِيْمَا اسْتَطَعْتَ (مسلم) جلد دوم

ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سمع و طاعت کی بیعت کرتے تو آپؐ فرماتے کہ یہ بھی کہو کہ جہاں تک میری طاقت میں ہو گا۔

غرض دین کا یہ ایک مسلم اصول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام کی بجاآوری کا جو مطالبہ فرمایا ہے وہ انسان کی واقعی طاقت کی حد ہی تک کا ہے اس سے زیادہ کا قطعاً نہیں ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اقامت دین کے معاملے میں بھی اس اصول کا لحاظ نہ ہو۔ یقیناً ہو گا اور اس کام میں حالات کی ناسازگاریاں' ماحول کی دقتیں اور ذرائع کی کم یابیاں جس قدر مزاحم ہوں گی اسی قدر ہمیں اللہ تعالیٰ کی جناب سے رعایت بھی ضرور ملے گی۔ اسی طرح مختلف افراد کے حق میں ان موانع کی نوعیتوں کا جو تفاوت ہو گا' اس تفاوت کا بھی پورا پورا لحاظ فرمایا جائے اور ہر فرد کو اس کے دربار عدل میں صرف اسی حد تک جواب دہی کرنی پڑے گی جس حد تک اسے جدوجہد کی طاقت میسر ہے۔ اگر ایک شخص کو کام کے اچھے ذرائع اور ماحول کی سازگاریاں حاصل ہیں لیکن اس کے باوجود اپنے مقدور بھر قیام دین کی کوشش بجا نہیں لاتا تو لازماً" ادائے فرض میں کوتاہی دکھانے کا مجرم قرار پائے گا۔ خواہ اپنی اس کم توجہی کے باوجود ظاہری نتائج کے اعتبار سے کتنا ہی آگے کیوں نہ نکل گیا ہو۔ اس کے بخلاف اگر دوسرے شخص نے اپنی تمام ممکن کوششیں صرف کر ڈالیں لیکن ذرائع کے ناپید اور حالات کے ناسازگار ہونے کے باعث آخر تک کچھ نہ کر پایا' اور بس منزل مقصود کی سمت اپنا رخ جمائے وہیں کا وہیں کھڑا رہ گیا جہاں سے اس نے اپنی کوششوں کا آغاز کیا تھا تو اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ وہ ہر طرح اپنے فرض کو ادا کر گیا اور اللہ کے حضور اس پر کوئی الزام نہ لگے گا۔ اس لئے مومن کی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ جیسی کچھ اسے طاقت حاصل ہو اور

جس طرح کے حالات میں وہ ہو' انہی کے مطابق اپنی کوششیں انجام دیتا رہے۔ پھر جیسے جیسے ان حالات میں تغیر ہوتا' اور اس کی اپنی قوت کار میں فرق آتا جائے۔ اپنی جدوجہد کا دائرہ بھی اسی کی مناسبت سے تنگ یا وسیع کرتا رہے۔

اس بات کو ایک مثال سے سمجھئے' نماز ہم پر فرض ہے جس میں قیام' رکوع اور سجدہ وغیرہ چند چیزوں کا ادا کرنا ضروری ہے۔ ایک شخص اگر قیام پر قادر ہونے کے باوجود بیٹھ کر نماز پڑھتا ہے تو اس کی نماز نہیں ہوتی۔ حتیٰ کہ اگر کسی واقعی مجبوری کی وجہ سے وہ بیٹھ کر نماز پڑھ رہا ہو۔ لیکن دو رکعتیں پڑھ چکنے کے بعد اس کی یہ مجبوری دور ہو جاتی ہو اور اب وہ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے پر قادر ہو گیا ہو تو اس کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ باقی رکعتیں وہ کھڑے ہو کر ہی پڑھے اور جیسے ہی اسے اپنے عذر کے جاتے رہنے کا احساس ہو جائے فوراً" اٹھ کھڑا ہو۔ ٹھیک یہی حال اقامت دین کی جدوجہد کا بھی ہے۔ جس شخص کو جس وقت جتنی قوت میسر ہو اس وقت اتنی ہی جدوجہد اس کے لئے ضروری ہے۔ نہ اس سے زیادہ کا وہ مکلف ہے نہ اس سے کم میں اس کی خیر ہے۔ زمین پر مکمل طور پر اللہ کے دین کو بالفعل قائم اور نافذ کر دینا ایک آخری غایت (گول) ہے جہاں تک پہنچنے کی مسلسل کوشش مسلمانوں کی منصبی ذمے داری ہے اور جہاں تک پہنچ جانا ہر مسلمان کی لازماً" ایک محبوب آرزو ہونی چاہئے۔ مگر وہاں بہر صورت پہنچ جانا اس پر واجب ہرگز نہیں قرار دیا گیا ہے۔ اس پر جو کچھ واجب قرار دیا گیا ہے وہ صرف یہ ہے کہ اس گول کی طرف اتنے قدم آگے بڑھتا جائے جتنے قدم کہ وہ فی الواقع آگے بڑھ سکتا ہے۔

واقعی ناکامی کا عدم امکان

جب اقامت دین کے فرض ہونے کا مدعا یہ ہے تو یہیں سے یہ سوال بھی حل ہو جاتا ہے کہ اس فریضے کی خاطر کی جانے والی جدوجہد میں کامیابی کا واقعی مفہوم کیا ہے؟ ظاہر بات ہے کہ جب اپنی استطاعت کے مطابق ہی کوشش کرنے کے ہم

مکلف ہیں تو پھر اس راہ میں ناکامی کا کیا امکان باقی رہتا ہے؟ یہ تو وہ راہ ہے جو خود ہی راہ بھی ہے' خود ہی منزل بھی' دنیا کی دوسری تمام تحریکوں اور سرگرمیوں کا معاملہ تو ضرور ایسا ہے کہ ان میں پوری پوری کوشش کے باوجود کامیابی کا بھی امکان ہوتا ہے اور ناکامی کا بھی۔ لیکن اقامت دین کی جدوجہد ایک ایسی جدوجہد ہے جس میں اگر پوری پوری کوشش انجام دے دی گئی تو پھر ناکامی کا کوئی امکان باقی ہی نہیں رہتا۔ کیونکہ مومن سے اس کے رب کا مطالبہ اس سے زیادہ کا ہے ہی نہیں کہ بس وہ اپنی طاقت اس کام میں لگا دے' اور اپنی آخری سانس تک لگائے رکھے۔ کل اس سے حساب بھی صرف اسی بات کا لیا جائے گا جس میں اگر ثابت ہو گیا کہ اس کا عمل ایسا ہی کچھ رہا ہے تو رضائے الٰہی اس کے لئے اپنی آغوش کھول دے گی اور آخرت کی فلاح سے وہ بہرحال شاد کام ہو کر رہے گا۔ اس لئے اس نے جب دنیا میں اس کوشش کا حق ادا کر دیا واضح طور پر اپنی زیست کا مقصد اور اپنے ایمان کا بنیادی تقاضا پورا کر گیا۔ تو اپنی زیست کے اصل مقصد اور اپنے ایمان کے بنیادی تقاضے کو پورا کر دینے کے سوا بھی کوئی چیز ہے جس کی تعبیر کے لئے کامیابی اور بامرادی کے الفاظ محفوظ کر لئے جانے چاہئیں؟

ہاں اس راہ میں ایک ناکامی ضرور ہے اور وہ یہ کہ اپنی قوتوں کو اس میں خرچ کرنے سے دریغ کیا جائے اور اپنی استطاعت کے مطابق کلمہ حق کی سربلندی میں سعی نہ کی جائے اس کے علاوہ اس میں کسی ناکامی کا کوئی خدشہ ہی نہیں۔ مومن اپنی قوتیں میدان سعی و جہد میں ڈال دینے کے بعد جس انجام سے بھی دوچار ہوتا ہے وہ بہرحال کامرانی کا انجام ہے۔ مایوسی و نامرادی کے نام سے بھی اس کی جدوجہد آشنا نہیں۔

کامیابی کا اسلامی تصور

اس بارے میں جو چیز مسلمانوں کی نگاہوں کا حجاب بن گئی ہے وہ دراصل اشیاء کی قدریں متعین کرنے کا وہ مادی اصول ہے جو آج ہر طرف ذہنوں پر چھایا ہوا ہے۔

لیکن جس کو قرآن مٹانا چاہتا ہے آج مسلمان بھی کسی چیز کے رد و قبول میں اسی دنیا میں ظاہر ہونے والے نتائج کو اسی زندگی کے نفع و نقصان کو سامنے رکھنے لگا ہے' اسی لئے وہ اس کوشش کو لاحاصل اور ناکام سمجھتا ہے جس کا کوئی فوری اور مادی فائدہ ظاہر ہوتا ہوا دکھائی نہ دے۔ حالانکہ قرآن نے اسے ترک و اختیار کی بنیاد اور کامیابی کا مفہوم کچھ اور ہی بتایا ہے۔ اس کے نزدیک مسلمان کی پہچان ہی یہ تھی کہ وہ آخرت کے مفاد کو دنیا کے مفاد پر ترجیح دینے والا ہوتا ہے اور اپنی کامیابی صرف اس بات میں سمجھتا ہے کہ اپنی ساری پونجی قیام حق کی راہ میں لگا دے۔ اس کے بعد اگر وہ پہلے ہی قدم پر اپنا سب کچھ کھو بیٹھتا ہے تو بھی اگر سارے عالم پر دین حق کا جھنڈا لہرا دیتا ہے تب بھی' ہر حال میں کامیاب ہی کامیاب ہے۔

ضرورت ہو تو قرآن کی واضح شہادت بھی سن لیجئے۔

منافقوں کی تمنا بھی تھی اور توقع بھی کہ اب جو روم کے افق سے طوفان جنگ نمودار ہو رہا ہے وہ ان مٹھی بھر سر پھرے مسلمانوں کو جو تمام دنیا کو دشمن بنائے بیٹھے ہیں پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے لے گا اور ان کے پرخچے اڑا کر رکھ دے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو حکم دیا کہ :-

قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَا اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ (توبہ)

(ان منافقوں سے) کہہ دو کہ تم ہمارے حق میں جس بات کا انتظار کرتے ہو وہ ہمارے لئے دو بھلائیوں میں سے ایک بھلائی ہی تو ہے۔

یہ آیت جو کچھ کہہ رہی ہے اسے غور سے سن رکھئے۔ وہ صاف اعلان کر رہی ہے کہ جس طرح مسلمانوں کا میدان جنگ جیت جانا ان کے لئے بھلائی اور کامیابی ہے اسی طرح ان کا ہار جانا اور جاں بحق ہو جانا بھی بھلائی اور کامیابی ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کی فتح بھی "حسنیٰ" ہے اور ان کی شکست بھی۔ گویا ایک مرد مومن جب جہاد فی سبیل اللہ کے لئے گھر سے نکلتا ہے تو ہر صورت میں تمغہ کامرانی ہی لے کر لوٹتا ہے بے شک یہ کامیابی بہت بڑی کامیابی ہے۔ کہ وہ اپنی تلوار سے دشمنوں کو زیر کر لے

اور حق کا بول بالا کر دے۔ لیکن دوسری صورت حال کو بھی ناکامی نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ اگر وہ اور اس کے تمام ساتھی خدانخواستہ لڑائی میں قتل ہو جائیں تو ایک مومن کے حقیقی مطمع نظر کے لحاظ سے یہ بھی اسی کے ہم پلہ ایک کامیابی ہے قابل صد رشک کامیابی' ایسی کامیابی جس پر دنیا کی ساری کامیابیاں قربان ہو جائیں۔ جس سے بڑی کامیابی کی آرزو ہی نہیں کی جا سکتی۔

یہ ایک جزئی مثال تھی جس کا تعلق مومن کی ایمانی زندگی کے صرف ایک مخصوص گوشہ سے ہے۔ اسی جزو سے کل کی طرف آیئے اور اسی فرع کو اصل بنا کر مومن کی پوری ایمانی زندگی .... اقامت دین کی جدوجہد .... پر پھیلا دیجئے۔ پھر معلوم ہو گا کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام' جن کو اسی جدوجہد کے جرم میں دار پر لٹکا دیا گیا تھا اور جو ایک بالشت زمین پر بھی دین حق کا نفاذ نہ کر سکے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں ٹھیک اسی طرح دنیا سے کامران و با مراد تشریف لے گئے جس طرح کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم' جنہوں نے ایک وسیع خطہ ارض پر عملاً" اللہ کا دین قائم کر دیا تھا مگر اس کھلے راز کو بھی سمجھنے اور قبول کرنے کے لئے مومن کا دل چاہیئے۔ عقل مصلحت پرست کے اندر یہ جذباتی باتیں کہاں سما سکتی ہیں؟

عملاً" قیام دین کے روشن امکانات

لیکن کامیابی کا جو مفہوم عام طور پر لیا جاتا ہے اس کے لحاظ سے بھی یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ آج کی دنیا میں اس جدوجہد کی ناکامی کی بہ نسبت اس کی کامیابی کا امکان زیادہ ہے۔ اگر امت مسلمہ کا دسواں بیسواں حصہ بھی اپنے اس فریضے کی انجام دہی میں دل و جان سے لگ جائے اور ٹھیک اسی طریقے سے لگ جائے۔ جس کا اس کا مزاج تقاضا کرتا ہے اور جس کی کتاب و سنت اور اسوۂ انبیاء سے ہدایت ملتی ہے تو اس کوشش کا بار آور ہونا اسی طرح یقینی ہے جس طرح اندھیری رات کے بعد چمکتے ہوئے سورج کا نکلنا یقینی ہوتا ہے۔ اس دعوے کی حقانیت آپ پر

بڑی آسانی سے واضح ہو جائے گی اگر ان چیزوں پر اور ان کے تقاضوں پر اچھی طرح غور کر لیں :۔

(۱) اقامت دین کے مخاطب اور ذمے دار گروہ کی خاص نوعیت

(۲) انسانی فطرت کی اصل پسند۔

(۳) انسان کا موجودہ فکری، عملی اور تمدنی ارتقاء اور اس کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ اس کی ذہنی بے چینی۔

عموماً لوگ کامیابی کے امکانات کا اندازہ لگاتے وقت پہلے ہی قدم پر ایک عظیم الشان حقیقت فراموش کر جاتے ہیں اور وہ یہ کہ یہ کام کسی بے اصول، خود غرض، تھڑدلے اور پست نظر گروہ کے سپرد نہیں ہے بلکہ ان لوگوں کے سپرد ہے جو مومن ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ یعنی جو قرآنی بیان کے مطابق ایک خدا پر ایمان رکھنے والے ہوتے ہیں اور اس کے سوا کسی کو پرستش اور رضا جوئی کا حق دار حقیقی اطاعت کا سزاوار اور طاقت و اقتدار کا مالک نہیں سمجھتے۔ جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا ہادی مانتے ہوں اور اپنی زندگی کے کسی شعبے میں ان کے سوا کسی کو قابل اتباع نہیں تسلیم کرتے۔ جو آخرت کو دنیا پر ہمیشہ مقدم رکھتے ہیں جو نماز، روزے اور حج زکوۃ وغیرہ عبادات کے بجالانا والے ہوتے ہیں۔ جو حق کے شاہد، سچائی کے مجاہد، معروف کے مبلغ عدل کے علمبردار، باطل کے حریف، منکر کے فطری دشمن، جھوٹ سے متنفر اور ظلم سے مجتنب ہوتے ہیں۔ جن کی پہچان یہ ہے کہ وہ برائی کو نیکی سے اور جہالت کو شرافت سے مٹائیں۔ جن کا شعار یہ ہے کہ وہ انصاف پر قائم رہیں اگرچہ اس کی زد خود ان کے اپنے ہی اوپر کیوں نہ پڑتی ہو۔ جن کا شیوہ یہ ہے کہ دشمن کے ساتھ بھی زیادتی کا سلوک نہ کریں۔ اگرچہ کتنے ہی مظالم ان کے ہاتھوں جھیل چکے ہوں۔ جو ہر حال میں اپنی راستی پر قائم رہتے ہیں۔ اگرچہ دنیا ہاتھ سے نکل جاتی ہو جو دوسروں کی عزت کو اپنی عزت سمجھتے اور دوسروں کی جان اور مال کی حرمت کو کعبہ کا مستحق باور کرتے ہیں۔ جو غیر کے لئے بھی وہی پسند کرتے ہیں جو اپنے لئے کرتے ہیں۔ جو خود

ننگے اور بھوکے رہ کر غریبوں کو کھلانے پلانے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ جن کے دامن یتیموں' بیواؤں اور کمزوروں کے لئے امن و سلامتی کی پناہ گاہیں ہوتی ہیں۔ اب اگر دنیا میں "مومنوں" کا کوئی گروہ موجود ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ کسی نہ کسی حد تک یہ صفات بھی اپنے اندر ضرور رکھتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ جب قیام دین کے امکانات کا جائزہ لیا جائے تو اسی گروہ اور اس کی انہی صفات کو سامنے رکھ کر لیا جائے۔ یہ نکتہ اگر نظر انداز ہو گیا تو ہرگز صحیح نتیجے پر نہیں پہنچا جا سکتا۔ اور اگر یہ نظروں کے سامنے رہا تو کوئی وجہ نہیں کہ "ناممکن" کا لفظ پھر بھی منہ سے نکل سکے۔ غور تو کیجئے' جو گروہ ایسے ایمانی اور اخلاقی اسلحوں سے مسلح ہو اس کے بارے میں یہ بدگمانی اور مایوسی کیسے کی جا سکتی ہے کہ وہ اللہ کے دین کو قائم کر ہی نہیں سکتا؟ خصوصاً" ایسی حالت میں جب کہ اس کی عددی کثرت بھی غیر معمولی حد تک زیادہ ہو اور دنیا کی کسی اور پارٹی کے ممبروں کی تعداد اس کی آدھی تہائی بھی نہ ہو؟ یہ صحیح ہے کہ یہ بھاری گروہ جن افراد پر مشتمل ہے ان کی بہت بڑی اکثریت ان مذکورہ بالا صفات سے تہی دامن ہو چکی ہے۔ مگر یہ کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ اس گروہ میں ایسے لوگ باقی ہی نہیں رہے جن میں یہ صفات موجود ہوں' نہیں ایسے لوگ اب بھی نایاب نہیں ہیں۔ البتہ کمیاب ضرور ہیں۔ اگر خاکستر کی ان چنگاریوں کو دنیا میں اجالا پھیلانے کا خیال اور بھڑکنے کا ڈھنگ آجائے تو یہ اندھیرے سنسار کو ایک دن جگمگا کر دم لیں گی۔

اب انسانی فطرت کو لیجئے۔ انسان اپنی اصل فطرت کے اعتبار سے خیر پسند ہے اور ایک قلیل تعداد کو چھوڑ کر عام افراد انسانی نیکی کی مقناطیسیت سے کھنچ اٹھنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ خالص باطل پرست اور شر پسند لوگ جو اس حالت کو دراصل اپنی فطرت کو مسخ کر لینے سے پہنچ جاتے ہیں دنیا میں بہت تھوڑے ہوتے ہیں۔ البتہ جب یہی گنتی کے شیطان انسانی زندگی کی اجتماعی مشینری پر قابض ہو جاتے ہیں اور قوموں کی زمام قیادت ان کے ہاتھوں میں چلی جاتی ہے تو عام لوگ محض ان کے پیچھے چل پڑنے کی وجہ سے برائی کی نجاستوں سے لتھڑ جاتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود خیر پسندی کا فطری ذوق ان کے اندر سے فنا نہیں ہو جاتا۔ اس لئے اگر نظری اور علمی دونوں طریقوں سے نور حق ان کے سامنے بے حجاب کرکے چمکایا جائے تو ان میں سے کچھ تو اس کی طرف عملاً بھی لپک پڑیں گے اور دوسروں میں اگر اتنی جرات نہ ہو گی تو اتنا ضرور ہی ہو گا کہ وہ اسے پسندیدگی کی نظروں سے دیکھنا شروع کر دیں گے۔ کوئی وجہ نہیں کہ عام انسان اس چیز کو اس کی اپنی صحیح شکل میں دیکھ لینے کے بعد بھی رد کر دے، جو اس کی فطرت کو مطلوب ہے اور اس چیز سے بدستور لپٹا رہے جس سے اس کی اصل فطرت ہم آہنگ نہیں۔

آخری قابل لحاظ چیز جسے اس سلسلے میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ زمانے کا ارتقائی رجحان اور انسان کی ذہنی بے چینی ہے۔ پچھلے زمانوں میں ایک تو انسانی فکر اپنی پختگی کو پہنچی نہیں تھی۔ دوسرے لوگوں میں گروہی اور مذہبی عصبیتیں حد سے زیادہ ہوتی تھیں اور وہ اپنے دلوں کے دروازے بیرونی آواز کے لئے مضبوطی سے بند رکھتے تھے۔ تیسرے تبلیغ و اشاعت کے ذرائع نہایت محدود تھے۔ ان اسباب کی بنا پر دین حق کی تبلیغ کے ظاہری نتائج اکثر ناکامی کی شکل میں نمودار ہوا کرتے تھے۔ مگر اب حالات بالکل بدلے ہوئے ہیں۔ انسان تحکمی عقائد کی اندھی پیروی اور اوہام پرستی سے اور اونچا اٹھ رہا ہے اور روز بروز حقائق پسندی کی طرف آ رہا ہے۔ عقلیں ان

اصول و نظریات کو چھانٹ کر دور پھینکتی جا رہی ہیں جو انسانی زندگی کے مسائل کو تسلی بخش طور پر حل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ مغربی تہذیب نے جہاں دنیا کو بے شمار نقصانات پہنچائے ہیں وہیں وہ ایک ایسی کیفیت بھی ذہنوں میں پیدا کر گئی ہے جس سے ایک ایسا دین عظیم الشان فائدے حاصل کر سکتا ہے جو مسائل زندگی کا صحیح، متوازن اور اطمینان بخش حل پیش کر سکے۔ اس تہذیب نے ان اوہام کی بہت کچھ بنیاد ڈھا دی ہے جو انسانی دماغ کا پردہ بنے ہوئے تھے ان اوہام کے ڈھ جانے کے ساتھ ہی ان مذاہب کی چھتیں بھی زمین پر آ گئی ہیں جن کی تعمیر ان اوہام پر ہوئی تھی اور جو صرف جذباتی عصبیتوں کے حصار ہی میں جی سکتے تھے۔ اس تہذیب کا جنم دراصل ایک فکری انقلاب کا نتیجہ تھا ایک تو انقلاب کی فطرت ہی بحرانی ہوتی ہے۔ دوسرے جہاں تک خاص اس انقلاب کا تعلق ہے تو اسے صحیح رخ پر موڑنے کی کوئی کوشش بھی نہ ہوئی۔ بلکہ اس کا راستہ روکا گیا اور وہ بھی نہایت بھونڈے بلکہ احمقانہ طریقے سے۔ اس لئے وہ اپنے جوش میں اوہام کے ساتھ بہت سے حقائق بھی بہا لے گیا اور دیگر مذاہب کی طرح خود اسلام کو بھی چیلنج کر گیا جو اپنی فطریت اور عقلیت کی وجہ سے اس کا صحیح رہنما ہو سکتا تھا۔ مگر اس بے اعتدال کے بکثرت تلخ نتائج اب اس کے علم برداروں کے سامنے آ چکے ہیں۔ اس لئے وہ اعتدال کی طرف لوٹنا چاہتے ہیں مختصر یہ کہ اس انقلاب نے ذہنوں میں جو بھونچال پیدا کر دیا ہے اس نے جاہلانہ مذہبی عصبیتوں کی بندشیں بڑی حد تک ڈھیلی کر دی ہیں اور ایسے بے شمار افراد پیدا کر دیے ہیں جو کسی بات کو صحیح سمجھ لینے کے بعد اسے تسلیم کر لینے میں اپنی روایتی معتقدات کو مانع نہیں پاتے۔ پھر فکر کی اس آزادی اور ذہن کی اس بے تعصبی کے علاوہ وقت کے تمدنی، معاشی اور سیاسی حالات نے بھی اسلام کے لئے کچھ زمین ہموار کر دی ہے۔ جب سے نظام عالم کی سیاسی باگ ڈور فاسق و فاجر اور خدا سے باغی ہاتھوں میں آئی ہے اور انہوں نے ہدایت الٰہی کو پس پشت ڈال کر زندگی کے نظام کو اپنے من مانے اصولوں پر چلانا شروع کیا ہے اس وقت سے نوع انسان برابر اپنی خود سری کے برے نتائج بھگتتی چلی آ رہی ہے اس کے

معنی یہ ہیں کہ انسانی دماغ کے بنائے ہوئے تمام نظام ہائے زندگی ایک ایک کرکے ناکام ثابت ہو چکے ہیں نہ صرف یہ کہ ناکام ثابت ہو چکے ہیں۔ بلکہ ان کی پیدا کی ہوئی پیچیدگیوں اور ان کی نازل کی ہوئی ہلاکتوں سے دنیائے انسانیت چیخ اٹھی ہے اور بڑی بے تابی سے ایک ایسے نظام حیات کی فی الواقع طلبگار ہے جو اس کے دکھوں کا مداوا ہو سکے۔

صورت واقعہ کے ان تینوں روشن پہلوؤں کو نگاہ میں رکھئے اور پھر فیصلہ کیجئے کہ دین کا قیام ممکن ہے یا ناممکن؟ کیا یہ صورت واقعہ ڈرنے' سہمنے' اور مایوس ہونے کی ہے؟ اگر نہیں' تو وہ لوگ کیوں نہ پورے اعتماد اور حوصلے کے ساتھ آگے بڑھیں۔ جو ایک طرف تو اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ پورا حق صرف اسلام کے پاس ہے اور زندگی کے مسائل کا صحیح اور تسلی بخش حل اس کے سوا اور کہیں ہے ہی نہیں۔ دوسری طرف انھیں اس بات میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ انسان بھلائی کا فطری طلب گار اور خدا کی بہترین مخلوق ہے۔ پیدائشی مجرم اور بدی کا پجاری نہیں ہے۔ البتہ ان لوگوں سے اس طرح کے کسی اقدام کی توقع رکھنا ضرور غلط ہو گا جن کے اندر کا یہ یقین رسمی عقیدت کی حدوں سے آگے نہ بڑھا ہو۔ کیونکہ ایسے "اہل ایمان" خواہ اسلام کے ان فضائل و محامد کا کیسے ہی فخر اور جوش سے اظہار کرتے ہوں۔ اور اس کی شان میں کیسے ہی عمدہ قصیدہ پڑھتے ہوں مگر چونکہ ان کی مدح سرائیوں کی جڑیں دل کی گہرائیوں میں نہیں ہوتیں اس لئے وہ عمل و اقدام کے پھل بھی نہیں دے سکتیں۔ ایسے لوگ اگر خدا کے دین سے مایوس ہوں تو انھیں مایوس ہونا ہی چاہئے اور خود یہ دین بھی ان سے مایوس ہی ہے مگر ان لوگوں کے لئے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں جو دین حق کی ان خوبیوں اور صلاحیتوں پر اپنی عقل اور بصیرت کے ساتھ ایمان رکھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں اور اگر نہیں جانتے تو انھیں جاننا چاہئے کہ دنیا کے عام حالات اور انسانی حقائق آج اسلام کے حق میں ہیں۔ آگے ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ جو فکری اور عملی طاقت انھیں حاصل ہے اسے وہ اسی کام پر مرکوز کر دیں کہ یہ دنیا بہرحال اسباب کی دنیا ہے۔ یہاں

جو کام بھی انجام پاتا ہے اپنے مقررہ طرز ہی پر انجام پاتا ہے۔ آپ کے اپنے دسترخوان کا لقمہ بھی آپ کے منہ میں نہیں پہنچ سکتا۔ جب تک اس کے لئے آپ اپنے ہاتھ کو حرکت نہیں دیتے اس لئے حالات کسی نصب العین کے حق میں کیسے ہی سازگار کیوں نہ ہوں' وہ کامیابی کی منزل پر اس وقت تک ہرگز نہیں پہنچ سکتا' جب تک کہ اس کے لئے ضروری تدبیریں اور مطلوبہ کوششیں زیر عمل نہ لائی جا چکیں۔ اقامت دین .... کا نصب العین بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہے اس لئے ان تمام روشن پہلوؤں کے باوجود جن کا ابھی تذکرہ کیا جا چکا ہے اس مقصد میں کامیابی اسی وقت ہو سکے گی جب کہ اس کے لئے مناسب تدبیریں اور مطلوبہ کوششیں اختیار کرلی جائیں۔

یہ تدبیریں اور کوششیں کیا ہیں؟ ان کو دو لفظوں میں اسلام کی "فکری" اور عملی "شہادت" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

فکری شہادت تو یہ ہے کہ اسلام کا بیسویں صدی کی زبان میں تعارف کرایا جائے اور آج کے ذوق و ذہن کو اپیل کرنے والے طرز استدلال سے اسے مدلل کرکے دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔ زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق اس نے جو ہدایات و احکام دیئے ہیں انہیں زمانہ حال کی تعبیروں میں ڈھال کر لوگوں پر واضح کردیا جائے کہ انسانی مسائل کا صحیح حل اور تمدن عالم کی صحیح رہنمائی صرف انہی ہدایات میں مضمر ہے۔

عملی شہادت یہ ہے کہ عمل کی زبان سے بھی اس پر اپنے یقین کا اظہار کیا جائے اور مشکل سے مشکل مواقع میں بھی اس کی راہ راست سے قدموں کو ہٹنے نہ دیا جائے' اللہ تعالیٰ سے اپنا تعلق مضبوط سے مضبوط تر کیا جائے۔ عبادتوں میں وہ روح پیدا کی جائے جس سے دلوں میں زندگی اور سیرتوں میں پاکیزگی آتی جائے۔ انفرادی اور اجتماعی دونوں قسم کے معاملات میں اسلامی اخلاق کی پوری پابندی کی جائے۔ قومی' وطنی' نسلی' خاندانی' طبقاتی اور ذاتی مفادات سے آنکھیں بند کرکے اصلاً" صرف اسلام کے مفاد کو سامنے رکھا جائے ظلم کا جواب عدل اور عفو و درگذر سے' بدی کا جواب نیکی

سے، جھوٹ کا جواب سچ سے اور بے اصولی کا جواب اصول پسندی سے دیا جائے کہ یہ سعی و جہد صرف اس مسلک حیات کی تبلیغ و اقامت کے لئے ہے جس پر ساری انسانیت کی فلاح موقوف ہے۔ اور پھر اس سعی و جہد میں حسب ضرورت اپنے عیش و آرام کو خیرباد کہنے، اپنی آرزوؤں کو پامال کرنے اور جانی و مالی قربانیاں دینے میں کم از کم اتنی ہی پامردی دکھائی جائے، جتنی کہ لینن اور اسٹالن کے ساتھیوں نے کیمونزم کی اقامت میں، نازیوں نے نازیت کی حمایت و سربلندی میں اور جاپانیوں نے میکاڈو کی رضا جوئی میں ابھی پچھلے دنوں دکھائی ہے۔

اگر فکری اور عملی شہادت کا یہ فریضہ انجام دے دیا گیا .... جو دیا یقیناً" جا سکتا ہے .... تو حق کی ساحرانہ قوت تسخیر کا دعویٰ ہے اور خدا کی سنت اس دعویٰ کی گواہ ہے کہ ایک دن یہ جدوجہد کامیاب ہو کر رہے گی۔ ذہنوں کی گرہیں کھل جائیں گی دل اس کی طرف کھنچ آئیں گے آنکھیں اس کے سامنے فرط عقیدت سے جھک پڑیں گی اور دنیا پھر سے "يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللّٰهِ أَفْوَاجًا" کا روح پرور منظر دیکھ لے گی۔

ہم جانتے ہیں کہ آج خدا کی زمین پر باطل کی مضبوط گرفت قائم ہے مگر ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ باطل اپنے ابدی اقتدار کا وثیقہ لے کر نہیں آیا ہے نہ وہ اس زمین کا جائز وارث ہے۔ قدرت نے زمین کو اصل مسکن حق کا بنایا ہے باطل کا نہیں۔ مگر ہوتا یہ ہے کہ جب حق اپنے علمبرداروں کی غفلت اور فرض ناشناسی کی وجہ سے اپنے اس گھر کو چھوڑ دیتا ہے تو باطل کا دیو اسے خالی پا کر قبضہ جما لیتا ہے۔ کیونکہ اس گھر کے بنانے والے نے اس کے لئے ضابطہ ہی یہ بنایا ہے کہ وہ کبھی بے آباد نہ رہے۔ اس لئے اگر وہ اپنے اصلی حقدار سے آباد نہیں رہ جاتا تو ناچار غاصب ہی کے لئے اپنے دروازے کھول دیتا ہے مگر ظاہر ہے کہ یہ ایک غیر فطری صورت حال ہوتی ہے جسے یہ گھر مجبوراً" ہی گوارا کرتا رہتا ہے اس لئے جب بھی اس کا اصل مکین اپنا قبضہ واپس لینے پر تل جاتا ہے تو قدرت کے مضبوط ہاتھ اس غاصب کو نکال کر لازماً" باہر کر دیتے

ہیں یہ ایک اصولی حقیقت ہے جس کی بنیاد کسی خوش گمانی پر نہیں بلکہ قرآن حکیم کے محکم بیان پر ہے اس نے فرمایا ہے :۔

جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا ؕ

(بنی اسرائیل ۔ ۸۱)

حق آگیا اور باطل مٹ گیا۔ بلاشبہ باطل مٹنے ہی والی چیز ہے۔

معلوم ہوا ہے کہ باطل کی زندگی صرف حق کی غیر موجودگی تک ہے۔ جب حق آئے گا .... آئے گا نہیں بلکہ یوں کہئے کہ جب لانے والے اسے لائیں گے تو باطل خود جگہ چھوڑ دے گا اس لئے یہ گمان کرنا کہ مطلوبہ کوششوں کے باوجود حق کا قیام ممکن نہیں دراصل اللہ تعالیٰ پر بے اعتنوی کا اظہار کرنا اور عہد شکنی کا بہتان لگانا ہے۔جو خدا اس باطل کی خاطر دی ہوئی قربانیوں کو بھی کامیاب بنا دیتا ہے جو اسے مبغوض ہے،کیا آپ سمجھتے ہیں کہ وہ اس حق کی خاطر دی ہوئی قربانیوں کو رائیگاں جانے دے گا جو اسے محبوب ہے۔حالانکہ اس کی طرف سے وعدے پر وعدے بھی کئے گئے ہیں کہ :۔

وَلَيَنْصُرَنَّ اللَّهُ مَنْ يَنْصُرُهُ ؕ (حج ۔ ۴۰)

اللہ ان لوگوں کی ضرور مدد کرتا ہے جو اس (کے دین) کی مدد کرتے ہیں۔

مَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مِنْ أَمْرِهِ يُسْرًا ؕ (طلاق ۔ ۴۰)

جو خدا ترسی کی روش اختیار کرتا ہے تو خدا اس کے کام میں اس کے لئے آسانی فراہم کر دیتا ہے۔

وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا ؕ وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ ؕ (طلاق ۔ ۲،۳)

جو کوئی خدا ترسی کی راہ پر چلتا ہے وہ اس کو راستہ مہیا کر دیتا ہے۔ اور اسے وہاں سے روزی دیتا ہے جہاں سے اسے روزی ملنے کا شان و گمان بھی نہیں ہوتا؛ اور جو اللہ پر بھروسہ رکھتا ہے تو وہ اس کے لئے کافی (ثابت) ہوتا ہے۔

اور اسی لئے اس سعی و جہد کے نتیجے میں اس نے ہمیں یقین دلایا ہے کہ:
اَلَا اِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْغَالِبُوْنَ (مائدہ۔۵۶)
سن رکھو اللہ کی پارٹی ہی غالب رہنے والی ہے۔

نیز اس نے یہ بات بھی فرما رکھی ہے اور کسی اشارے کنائے کے انداز میں نہیں، بلکہ صریح لفظوں میں فرما رکھی ہے کہ جب یہ پارٹی دشمن کے مقابل ہوتی ہے تو اس کی غیبی نصرتیں اس کی پشت پر ہوتی ہیں یہاں تک کہ آسمان کے فرشتے بھی اس کے پہلو بہ پہلو لڑنے کے لئے اتر آتے ہیں اور اس لئے وہ اپنے سے دس گنے دشمنوں پر بھی غالب آ کر رہتی ہے۔ بدر، احد، احزاب، اور حنین کی لڑائیوں میں یہ وعدے واقعہ بن چکے ہیں۔ لہٰذا یقین رکھنا چاہئے کہ جو فرشتے ان میدانوں میں آئے تھے وہ کہیں بھی آ سکتے ہیں اور قرآن بتاتا ہے کہ خدا کے بندے اور حق کے مجاہد جب چاہیں انہیں بلا سکتے ہیں۔ چنانچہ غزوۂ بدر کے واقعات پر تبصرہ کرتے وقت جب اللہ نے ملائکہ کے اترنے کا ذکر کر کے اپنی غیر معمولی نصرت فرمائی کا تذکرہ کیا تو ساتھ ہی اس خیال کو بھی دور کر دیا کہ ممکن ہے یہ نصرت کوئی وقتی قسم کی اور صرف اسی ایک واقعہ کے لئے رہی ہو .... فرمایا:
وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ (انفال)
یہ مدد خاص اللہ ہی کی جناب سے ہوتی ہے۔

فرمانے کا مدعا یہ ہے کہ فتح و نصرت خدا ہی کے ہاتھ میں ہے۔ جس طرح آج ہے کل بھی رہے گی۔ اس لئے اہل ایمان کو یہ تائید و نصرت ہر وقت حاصل ہو سکتی ہے اور اگر انہوں نے "اَنْصَارُ اللّٰہِ" ہونے کے حق ادا کر دیا تو اللہ تعالیٰ بھی ان کا "مولیٰ" اور "نصیر" بننے میں دیر نہ لگائے گا۔

یاد رکھئے۔ یہ سب وعدے اور ارشادات اس اللہ کے ہیں جس کے بارے میں مومن کا یہ یقین ہے کہ وہ کبھی غلط وعدہ نہیں کرتا اور جو وعدہ کرتا ہے اسے ضرور پورا کرتا ہے اور اگر کوئی اس یقین سے محروم ہے تو وہ مومن ہی نہیں ...... جھوٹ کہتا

ہے اگر اپنے آپ کو مومن کہتا ہے۔ حتیٰ کہ غلط نہ ہو گا اگر اسے انہی پیش روؤں کا " خلف الصدق" کہا جائے جو دین کی راہ میں مشکلات کو دیکھ کر بول اٹھتے تھے کہ اللہ ہم سے فتح اور غلبے کے وعدے کرکے دراصل دھوکہ دے رہا ہے۔ (مَا وَعَدَنَا اللّٰہُ وَ رَسُوْلُہٗ اِلَّا غُرُوْرًا" (احزاب - ۱۲)

کیا ان تمام حقیقتوں کے باوجود دین کے قیام کو ناممکن ہی کہا جاتا رہے گا اور کیا ایسا کہنا قلب و نظر کی بے بصیرتی یا پھر اوائے فرض سے بزدلانہ فرار کی دلیل نہیں؟ امکان کامیابی کے ان تمام روشن پہلوؤں کی موجودگی میں بھی اگر کوئی شخص قیام دین کی طرف سے مایوس ہی رہتا ہے تو یقیناً" وہ مومن کا کردار ادا کرتا ہے نہ مومنانہ ذہن کا ثبوت دیتا ہے۔ وہ بھولتا ہے کہ مایوسی ایمان کے نہیں بلکہ کفر کے خصائص میں سے ہے۔ ایسے لوگ حالات کی نام نہاد ناسازگاریوں کو دراصل اپنی فراری روش کا جواز ثابت کرنے کے لئے بہانہ کے طور پر استعمال کیا کرتے ہیں ورنہ انہیں بتانا چاہئے کہ آخر وہ کون سے حالات ہیں جن میں دین اللہ کا قیام و نفاذ ممکن ہوا کرتا ہے؟ یہ تو بالکل ظاہر بات ہے کہ دین حق کو قائم کرنے کی کوشش جہاں بھی اور جس وقت بھی درکار ہو گی وہاں اور اس وقت کوئی نہ کوئی دین باطل بالفعل قائم اور نافذ ضرور ہو گا۔ اس لئے معلوم ہونا چاہئے کہ باطل نظاموں میں سے وہ کون سا نظام "شریف" نظام ہے جو نظام حق کے قیام و نفاذ کے لئے اپنی مملکت از خود چھوڑ دیا کرتا ہے تاکہ اس کی آمد کا انتظار کیا جائے اور جب وہ آکر نظام حق کی تاجپوشی کے لئے دربار حکومت بنا سجا دے تو اس کے ہم "وفادار" خدام تزک و احتشام سے اسے لے جا کر تخت پر بٹھا دیں۔ کیا یہ دنیا کی پوری زندگی میں اس طرح کا کوئی حق نواز باطل کبھی پایا گیا ہے؟ اور کیا دین حق کی اقامت کے لئے جب جب کوششیں کی گئی ہیں اس وقت کے حالات اس کام کے لئے ضرور ہی سازگار تھے؟ اور آئندہ ہمیں بھی ایسے خوش آئند حالات پیدا ہو جانے کی امید ہے؟ مستقبل کے پردے میں کیا کچھ چھپا ہوا ہے اس کا علم تو خدا ہی کو ہے۔ مگر ماضی کے حالات اور واقعات کے آئینے میں تو صورت واقعہ کا مشاہدہ ہم بھی کر سکتے ہیں ان

حالات اور واقعات کی گہری نظر سے جائزہ لیجئے اور پھر بتایئے کہ دینی تاریخ کے اس پورے سلسلے میں' جو حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر ہم تک پہنچتا ہے۔ اقامت دین کے لئے جتنی کوششیں کی جا چکی ہیں کیا ان سب کے زمانے اس کام کے لئے آج کی بہ نسبت لازماً" زیادہ سازگار تھے؟ اس کے ثبوت میں کیا حضرت نوحؑ کے زمانے کا نام لیا جا سکتا ہے جب کہ ساڑھے نو سو برس تک ان پر گالیوں اور پتھروں کی بارش ہی ہوتی رہی تھی؟ یا کیا حضرت ابراہیمؑ کے زمانے کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ جب کہ نمرود کی "خدائی" قائم تھی اور حضرت ممدوح کو آخر کار انگاروں کی بھٹی میں جھونک دیا گیا تھا یا کیا حضرت عیسیٰؑ کا زمانہ اس خیال کی شہادت بن سکتا ہے۔ جس میں چاروں طرف رومن ایمپائر کی طاغوتیت چھائی ہوئی تھی اور چند برسوں کے اندر ہی اندر انہیں پھانسی کا حکم سنا پڑ گیا؟ پھر کیا پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ اس نقطہ نظر کے حق میں پیش کیا جا سکتا ہے جب کہ خود مرکز توحید تین سو ساٹھ بتوں کا گڑھ اور جاہلیت کی راجدھانی بنا ہوا تھا' اور دعوت حق کا جواب دل آزاریوں اور ایذا رسانیوں' کانٹوں اور پتھروں' سماجی بائی کاٹ اور قتل کے منصوبوں سے دیا جا رہا تھا .... اگر انبیائی دعوتوں کو کسی تاویل سے اپنے لئے ماورائے مثال قرار دے لیا جائے تو اچھا' ذرا نیچے بھی اتر کر دیکھ لیجئے دیکھئے' یہ مجدد الف ثانی کا زمانہ ہے' اس میں "مسلمان" حکومت اسلام کے خلاف اپنا پورا زور صرف کرتی نظر آ رہی ہے اور یہ سید احمد بریلویؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کا زمانہ ہے جس میں اہل اسلام کے سینوں پر ایک طرف انگریز اور دوسری طرف سکھ سوار دکھائی دے رہے ہیں اور داڑھیوں تک پر ٹیکس لگا ہوا ہے نام لے کر بتایئے ان زمانوں میں سے کون سا زمانہ ہے جس کو دعوت حق کے لئے موجودہ زمانے سے زیادہ سازگار کہا جا سکتا ہے؟ کیا یہ ایک حقیقت نہیں ہے کہ ان میں سے ہر زمانہ اقامت دین کے لئے اس سے کہیں زیادہ پر خطر اور مایوس کن اور ناسازگار تھا جتنا کہ آج ہے؟ پس اگر ناسازگاریوں کا لحاظ کیا جائے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ آغاز آفرینش سے اب تک ایک فیصدی دور بھی ایسے نہیں آئے بلکہ یوں

کہنا چاہئے کہ کوئی دور بھی نہیں آیا جو اس جدوجہد کے لئے سازگار تھا مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ایسے سخت زمانوں اور ناموافق حالات میں بھی کتنی ہی کوششیں کامیاب ہو گئیں۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم نے دنیا جہاں کی ساری ناکامیاں اسی زمانے کے لئے کیوں مقدر مان لی ہیں؟ اور ساری مایوسیوں کو اپنے ہی لئے کیوں مخصوص سمجھ لیا ہے؟

مزید ستم ظریفی یہ کہ "ناممکن" ہونے کا یہ فتویٰ بھی کسی عملی تجربے کی سند کے بغیر ہی دیا جا رہا ہے۔ جب اس کام کی خاطر کبھی براہ راست کوشش ہم نے کی ہی نہیں۔ تو آخر کس دلیل کی بنا پر یہ ناممکن' ناممکن کا شور کیا جا رہا ہے؟ اگر ہم نے فکر و عمل کی ساری قوتوں کے ساتھ' اور طریق انبیاء کے مطابق' یہ کوشش کر لی ہوتی اور اس کے بعد بھی ساحل مراد دکھائی نہ دیا ہوتا تو بہر حال یہ ایک تجربہ ہوتا جو عدم امکان کے دعوے کے حق میں بطور دلیل پیش کیا جا سکتا تھا۔ مگر یہ عجیب دھاندلی ہے کہ دریا میں اترتے نہیں اور دور سے کھڑے کھڑے اس کی گہرائی کے اتھاہ ہونے کا دعویٰ کر رہے ہیں یقین فرمایئے جو ذہنیت آج کے حالات کو ناسازگار کہتی ہے اور ان کی موجودگی میں کامیابی کو ناممکن قرار دے رہی ہے۔ وہ قیامت تک کسی امکان کے پا لینے میں ناکام ہی رہے گی۔ اور اس کے لئے کوئی زمانہ ایسا آ ہی نہیں سکتا۔ جس میں اس جدوجہد کو شروع کیا جا سکتا ہو۔ جس باطل سے آج وہ لرزاں ہے وہی ہمیشہ رہے گا۔ صرف اس کی شکلیں بدلتی رہیں گی۔ مگر قیام حق کے مقابلے میں ہر باطل ہی ہے وہ اپنے کسی دور اور اپنی کسی شکل میں بھی حق کو زندگی کا رہنما بننے کا روادار نہیں ہو سکتا اور نہ ٹھنڈے پیٹوں اسے اپنے سامنے پاؤں جمانے کا موقع دے سکتا ہے۔ جب بھی اقامت حق کے لئے جدوجہد کی جائے گی وقت کا باطل اپنے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر لازماً سامنے آئے گا اور اہل حق کو مختلف شکلوں میں وہی تمام زحمتیں' رکاوٹیں' مشکلیں اور مصیبتیں استقبال کے لئے موجود ملیں گی جن کا آج تصور کیا جا سکتا ہے۔ بھولنا نہ چاہئے کہ یہ راہ ہمیشہ خارزاروں اور شعلہ کدوں ہی سے ہو کر گزرے گی۔ وہ امکان اور وہ سازگاری' جس کی تلاش ہے اس راہ کے مسافروں کو نہ کبھی ملی ہے نہ مل سکتی

ہے۔ قرآن نے اس حقیقت کو اتنی وضاحت سے بیان کر دیا ہے کہ غلط فہمی یا خوش گمانی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ گئی ہے وہ بار بار فرماچکا ہے کہ ایمان کو طرح طرح کی آزمائشوں سے جانچا پرکھا جاتا ہے اور اللہ کے حضور وہ اس وقت تک مقبول نہیں ٹھیرتا جب تک کہ وہ اس بھٹی میں تپائے جانے کے بعد لپنے کو کھرا نہ ثابت کر دے۔ حتیٰ کہ حالات اگر بظاہر بالکل سازگار اور بے خطر دکھائی دیتے ہوں تو بھی قدرت انہیں ناسازگار اور خطرناک بنا دیا کرتی ہے۔ تاکہ ایمانی دعووں کی صداقت جانچی جا سکے۔ اس حقیقت کے ہوتے ہوئے اس منطق کی داد بھلا کون دے سکتا ہے کہ حالات سخت ناسازگار ہیں اور فضا خطرات سے بھری ہوئی ہے اس لئے دین کی اقامت کا نام لینا صحیح نہیں .... قرآن حکیم کے نزدیک تو مشکلات اور مصائب کے ذریعے دعوائے ایمان کی آزمائش ضروری ہے لیکن اس کے ماننے والوں کا حال یہ ہے کہ وہ آزمائش میں کامیاب ہو کر اپنے مومن ہونے کا ثبوت پیش کرنے کی بجائے اسے اُلٹا اپنے ادائے فرض سے سبکدوش ہونے کی سند جواز بنائے لے رہے ہیں۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ فوج کا کوئی سپاہی میدان جنگ کا رخ کرنے سے اس لئے انکار کر دے کہ وہاں سے توپوں کے چھوٹنے اور بموں کے پھٹنے کی وحشت ناک آوازیں آ رہی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ سمجھے یہی جا رہا ہو کہ مجھے ملک و ملت کا ایک وفادار اور فرض شناس سپاہی کہا جانا اور بہادری کے تمغے کا مستحق تسلیم کیا جانا چاہئے۔ حالانکہ یہ میدان جنگ ہی وہ جگہ ہے جہاں اس اعزاز کا استحقاق حاصل کیا جا سکتا ہے۔

قومی مفاد کا بت

اس سلسلہ میں قومی مفادات کی دہائی بھی کچھ کم حیرت انگیز نہیں کیونکہ اس " دلیل " کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ جس مسلمان کو ہر حال میں انصاف پر مضبوطی سے قائم رہنے اور اللہ کے لئے حق کی بے لاگ شہادت دینے کی تعلیم دی گئی تھی۔ خواہ اس شہادت میں اسے خود اپنی ہی ذات کے سلئے لپنے والدین ہی

کے یا اپنے اقرباء ہی کے خلاف صف آرا ہونا پڑ جائے (کُونُوا قَوَّامِینَ بِالْقِسْطِ) اور جس کے متعلق یہ طے کیاجا چکا ہے کہ اللہ نے اس کے جان و مال کو جنت کے عوض خرید لیا ہے (اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی الخ) اب اسی مسلمان کو گویا اس بات کی تلقین کی جا رہی ہے کہ اگر انصاف کی راہ چلنے اور حق کی شہادت دینے میں تیری ذات کا یا تیرے خاندان کا یا تیری قوم کا نقصان ہوتا ہے تو ایسے انصاف کو دیوار پر دے مار اور ایسی شہادت حق پر لعنت بھیج! اگر اللہ کی رضا جوئی اختیار کرنے سے تیری جان یا تیرے مال پر آنچ آتی ہو تو ایسی خدا طلبی کو دور سے سلام کر! غور تو کیجئے قومی مفاد کی محبت میں اپنے مقصد وجود ہی کو چھوڑ بیٹھنے کا خیال کوئی معمولی خیال ہے؟ یا یہ زندگی کا ایک مستقل بنیادی نظریہ ہے جس کی اساس پر بننے والی عمارت اس عمارت سے یکسر مختلف ہوتی ہے جسے اسلام یا قرآن تعمیر کرنا چاہتا ہے؟ اس نظریے کو اختیار کر لینے والا اگر اپنے کو مسلمان کہتا ہے تو کہے مگر اسے تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ ایک ایسا "مسلمان" ہے جس کی نگاہ میں بنیادی اہمیت دین اور قیام دین کو نہیں بلکہ اس کے اپنے معاشی اور سیاسی مفاد کو حاصل ہے جو ایسا کوئی راستہ اختیار کر ہی نہیں سکتا جس کا تقاضا اسلام چاہے کیسے ہی شد و مد سے کرتا ہو مگر اس کے اختیار کرنے سے اس کو اپنا یا اپنی قوم کا کوئی مادی مفاد خطرے میں پڑتا دکھائی دیتا ہو اور جو دین کو دنیا پر، آجلہ کو عاجلہ پر، معاد کو معاش پر رضائے الٰہی کو قومی مفاد پر یعنی مقصد زندگی کو زندگی پر قربان کر دینے ہی کو دانش مندی سمجھتا ہے۔ کیا اس ذہنیت کو مومنانہ ذہنیت سمجھا جا سکتا ہے؟ کیا یہ وہی انداز فکر ہے جو قرآن اپنے پیروؤں کو سکھاتا ہے؟ اگر یہ ذہنیت اور یہ انداز فکر ایک مومن اور پیرو قرآن کا ہو سکتا ہے تو پھر وہ کون سی ذہنیت اور انداز فکر ہے جسے ہم کفر اور ملحدیت کا مخصوص انداز کہہ سکتے ہیں؟ کیا ہمیں قرآن کی یہ بات یاد نہیں رہی کہ "اللہ نے کسی شخص کے سینے میں دو دل نہیں بنائے ہیں" (مَا جَعَلَ اللّٰہُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَیْنِ فِیْ جَوْفِہٖ (احزاب ۴) اور جب ہر شخص کے سینے میں دل ایک ہی ہے تو اس میں بیک وقت دو محبوبوں اور دو "معبودوں" کی گنجائش کہاں سے نکل سکتی ہے۔ اس

میں آباد تو صرف ایک ہی کی محبت ہو سکتی ہے' یا تو خدا کی یا قوم اور قومی مفاد کی اس لئے حضرت مسیحؑ کی زبان میں اسی بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ "آدمی دو مالکوں کی خدمت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یا تو ایک سے عداوت رکھے گا اور دوسرے سے محبت' یا ایک سے ملا رہے گا اور دوسرے کو ناچیز جانے گا۔ تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے۔" (متی باب ٦)

غرض اس نظریئے کے ساتھ خدا پرستی کا جوڑ کبھی نہیں لگ سکتا۔ یہ ایک روشن حقیقت ہے آسمان کے سورج سے زیادہ روشن' اس لئے جس قسم کے مفاد قومی کی دہائی دی جا رہی ہے وہ ایک خطرناک بت ہے جسے توڑے بغیر اسلام کا مفاد پورا نہیں کیا جا سکتا۔

زمانہ نبوت میں بہت سے منافقوں کے نفاق کی بنیاد بھی اسی مفاد پرستانہ ذہنیت پر تھی ایمانی اخلاص کے مطالبے کے جواب میں وہ کہا کرتے تھے کہ:

نَخْشٰى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَة (مائدہ)

ہمیں ڈر ہے کہ ہم پر کوئی مصیبت آجائے گی۔

یعنی اگر ہم اخلاص کے ساتھ اور بالکل یکسو ہو کر ملت اسلامی میں علانیہ شامل ہو گئے تو ہم کو مصیبتیں گھیر لیں گی۔ ماحول ہمارا دشمن ہو جائے گا اور اسلام کی وجہ سے ہم سارے جہاں کی عداوتوں کا نشانہ بن جائیں گے۔

. اسی طرح بہت سے تمردولے کفار کا بھی یہی کہنا تھا کہ محمدؐ ہم تمہاری تعلیمات کی سچائی کا انکار نہیں کرتے۔ مگر ہماری اس مشکل کا کیا علاج کہ :-

اِنْ نَتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا (قصص - ٥٧)

اگر ہم آپ کے ساتھ ہدایت الٰہی کے پیرو بن جائیں تو (مادر) وطن (کی گود) سے اچک لئے جائیں گے۔

یہ دونوں گروہ اتباع حق کے مقابلے میں جس انداز فکر اور طرز استدلال سے کام لے رہے تھے کیا آج قومی مفاد کی باتیں انہی کی یاد تازہ نہیں کر رہی ہیں؟ قرآن

سراپا حق ہے پیغمبرؐ صادق و مصدوق ہے۔ اسلام کی صحیح پیروی ہی فلاح اور خوش بختی کا واحد ذریعہ ہے .... لیکن اگر قرآن کے مطالبے' رسول کی ہدایات اور اسلام کے تقاضوں پر عمل ہوا تو ہم برباد ہو جائیں گے! ہمیں اندیشہ نہیں بلکہ یقین ہے کہ زمانہ بھر کی آفتیں ہم پر ٹوٹ پڑیں گی! ذرہ ذرہ ہماری مخالفت پر کمر باندھ لے گا۔ ہم معاشی غلام اور سیاسی اچھوت بن جائیں گے! افسوس! ذرا نہ سوچا گیا کہ یہ قومی مفاد کا بچانا ہے یا اللہ کے غضب کو دعوت دینا؟

صحیح مفادات کے تحفظ کی قطعی ضمانت

یہ جو کچھ عرض کیا گیا' یہ فرض کرکے عرض کیا گیا کہ قومی مفادات کی تباہی کا اندیشہ ایک واقعی اندیشہ ہے۔ لیکن کیا حقیقت بھی اس مفروضے کے مطابق ہی ہے؟ کیا امت اگر دین کی ہو رہی تو دنیا سے فی الواقع اسے ہاتھ دھوئی لینا پڑے گا۔ قرآن مجید کا کہنا ہے کہ نہیں' ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ حقیقت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ یعنی اقامت دین کا فریضہ اگر بجالایا گیا تو اس سے صرف آخرت ہی نہیں سنورے گی بلکہ اس کی دنیا بھی اجلی ہو جائے گی اور کسی ایسی چیز سے محروم نہ رہ جائے گی۔ جس کی عالی حوصلہ قومیں طلب گار اور آرزو مند ہوا کرتی ہیں۔ چنانچہ وہ ان محبوب و مطلوب چیزوں میں سے ایک ایک چیز کا نام لے کر "باایمان" مومنوں کو اس کے لازمی حصوں کی بشارت دیتا ہے مثلاً باعزت امن و اطمینان کی زندگی کے بارے میں جو صحیح قومی مفادات میں سے ایک اہم مفاد ہے۔ وہ فرماتا ہے :-

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِکَ لَهُمُ الْاَمْنُ

(انعام۔ ۸۳)

جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کو شرک سے آلودہ نہیں کیا۔ ان کے لیے امن ہے۔

اسی طرح معاشی خوشحالی کے متعلق وہ اللہ جل شانہ' کے یہ ارشادات سناتا ہے

کہ:

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰی اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (اعراف ۹۶)

اگر بستیوں والے ایمان لائے اور تقویٰ کی راہ چلے ہوتے تو ہم ان پر آسمانوں اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ (مائدہ۔۶۶)

اگر یہ اہل کتاب توراۃ اور انجیل کو اور ان ہدایتوں کو جو ان کے رب کی طرف سے ان پر اتاری گئی تھیں قائم کرتے تو اپنے اوپر سے بھی رزق پاتے اور اپنے قدموں کے نیچے سے بھی۔

سیاسی سربلندی کے بارے میں' جسے غالباً قومی مفادات میں سب سے زیادہ نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ وہ اللہ رب العزت کی طرف سے یہ قول دیتا ہے کہ:

اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ (انبیاء۔ ۱۰۵)

بے شک زمین کی وراثت میرے صالح بندوں کو ملتی ہے۔

اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (آل عمران۔ ۱۳۹)

تم ہی غالب رہو گے اگر ایمان والے ہوئے۔

ان الگ الگ یقین دہانیوں کے علاوہ اس کی ایک جامع یقین دہانی بھی سنئے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۚ ط (نور۔ ۵۵)

اللہ تعالیٰ کا تم میں سے ان لوگوں سے' جو ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے عمل کئے یہ وعدہ ہے کہ وہ انہیں زمین میں اقتدار عطا فرمائے گا۔ جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں کے معاملے میں وہ ایسا کرتا رہا ہے اور ان کے لئے ان کے اس دین کی

جڑیں گہری جما دے گا جسے ان کے لئے اس نے پسند فرمایا ہے اور ان کے خوف کو امن و سلامتی سے بدل دے گا۔

پھر اسی بات کو منفی شکل میں بھی دیکھئے۔

لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ (مائدہ ـ ۱۰۵)

بھٹکے ہوئے لوگ تمہارا کچھ بگاڑ نہ سکیں گے جب تم سیدھی راہ پر ہو گے۔

قرآن مجید کے یہ سارے وعدے اور اس کی یہ یقین دہانیاں آپ کے سامنے ہیں ان کی روشنی میں اس خوف' بربادی کی حقیقت پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے جو اقامت دین کا نام سنتے ہی قومی مفاد کے نام نہاد پاسبانوں پر طاری ہو جایا کرتا ہے۔ کیا اب بھی ایمان کش خام خیالی کو کوئی وزن دیا جا سکتا ہے کہ یہ جدوجہد مسلم مفادات کو نگل جائے گی؟ یا اس کے برعکس یہ باور کرنا ضروری ہو جاتا ہے کہ اگر ایمان و عمل صالح کی جرات مندانہ زندگی اختیار کر کے صحیح معنوں میں یہ فریضہ انجام دیا گیا تو اس کے نتیجے میں ہمیں ہر وہ چیز مل جائے گی اور قطعاً" مل جائے گی جسے قوم و ملت کا واقعی مفاد کہا جا سکتا ہے۔

لیکن اگر کسی بد نصیب کو خود ایمان کی قوت تسخیری ہی سے بدگمانی ہو اور اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر اسے اعتماد ہی نہ ہو تو بڑی زبردستی کرتا ہے اگر اس کے باوجود بھی وہ امت مسلمہ کے معاملے میں کچھ بولنے کا اپنے کو حق دار سمجھتا ہے۔ بلاشبہ ایسے لوگوں کو کوئی بڑی سے بڑی دلیل بھی خوف اور مایوسی کی دلدل سے نہیں نکال سکتی۔ ان کے نزدیک تو اقامت دین کی جدوجہد کیا' نفس اسلام ہی خوف اور تباہی کا سامان ہے۔

ہاں اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس جدوجہد کے نتیجے میں عزت و اقبال اور امن و خوشحالی کا حصول بڑی دشواریوں اور قربانیوں کے بعد ہی ہو گا اور ابتداء میں ملت کو کچھ نہ کچھ کھونا ضرور پڑے گا۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ دشواری کچھ اسی مقصد کی راہ میں نہیں آتی بلکہ یہاں ہر بڑے مقصد کی خاطر اسی طرح کی قربانیاں دینی

پڑتی ہیں اور جسے کچھ پانا ہوتا ہے وہ پہلے کچھ نہ کچھ کھو ضرور لیتا ہے۔ ایک کسان فصل اٹھانے کے زمانے میں اپنے کھتے اسی وقت بھر سکتا ہے جب کہ تخم ریزی کے زمانے میں اس نے اسے بقدر ضرورت خالی بھی کیا ہو۔ اس لئے قومی مفادات کی اگر فصل کاٹنی ہو تو اس کے لئے پہلے تخم ریزی کا صرافہ اور دیگر ضروری مشقتیں برداشت کرنی ہی پڑیں گی اور اس حد تک مفادات سے دست برداری کا اندیشہ ہی نہیں بلکہ یقین بالکل بجا ہے لیکن کیا چند پیسے دے کر اشرفیوں کا توڑا حاصل کرلینا کوئی گھاٹے کا سودا ہے اور کیا اسے مفادات کی جاہی کہا جائے' یا ان کے بہتر سے بہتر حصول اور تحفظ کی بہتر سے بہتر ضمانت؟

پھیر کا راستہ

اب رہا یہ سوال کہ آیا ناسازگار حالات کے پیش نظر ہم نصب العین کے لئے براہ راست جدوجہد کرنے کے بجائے کوئی پھیر کا راستہ اختیار کر سکتے ہیں؟ تو اس سوال کا جواب کسی طرح بھی اثبات میں نہیں دیا جا سکتا۔ نہ تو عقل اس کی حمایت کرتی ہے نہ حق کی فطرت اسے گوارا کرنے کو تیار ہے اور نہ اب تک کی تاریخ سے اس بات کا کوئی ثبوت ملتا ہے۔ کہ اس مقصد کو صحیح معنوں میں اپنا مقصد زندگی قرار دینے والے کو کسی شخص یا گروہ نے یہ پالیسی اختیار کی تھی۔ یہ جدوجہد متمدن اور غیر متمدن' آزاد اور غلام' دولت مند اور غریب غرض ہر طرح کی قوموں کے اندر چلتی رہی ہے اور ہر طرح کے حالات میں انبیاء آتے رہے ہیں۔ مگر ہر ایک نے آتے ہی سب سے پہلی آواز جو منہ سے نکالی وہ یہی اور صرف یہی تھی کہ :-

اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ (نحل :- ٣٦)

(اے بندگان خدا) خدا کی بندگی کرو اور طاغوت سے دور رہو۔

کاوش کے باوجود بھی کسی نبی کو اس راست پالیسی سے ہٹ کر کوئی پھیر والی پالیسی اختیار کرتے ہوئے نہیں پایا جا سکتا۔ ابھی اس سوال کو چھوڑ دیجئے کہ ان حضرات

نے ایسا کیوں کیا؟ پہلے اس حقیقت کو اچھی طرح پرکھ کر دیکھ لیجئے کہ ایسا ہی ہوا یا نہیں؟ اگر ایسا ہی ہوا جیسا کہ واقعہ ہے تو پھر ان لوگوں کے لئے جو اسوۂ انبیاء ہی کو اپنا مرجع کامل مانتے ہوں۔ اس طریق کار کو چھوڑ بیٹھنا جائز کس حجت شرعی کی بنا پر ہو سکتا ہے؟ اگر حالات زمانہ کے اختلافات کوئی چیز ہیں تو کیا اس بات کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ تمام انبیاء کے زمانے تو بالکل یکساں نوعیت کے تھے جس کی وجہ سے ان سب کے طرز عمل میں ایسی مکمل یکسانی اور ہم رنگی پائی جاتی ہے اور یہی بیسویں صدی کا زمانہ ایک ایسا انوکھا اور غیر معمولی زمانہ ہے جس کے حالات یکایک اب تک کی پوری انسانی تاریخ کے حالات سے یکسر مختلف ہو گئے ہیں؟ یقیناً کوئی بھی سمجھ بوجھ رکھنے والا انسان اس طرح کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ سب جانتے ہیں کہ کچھ بنیادی حقائق تو ایسے ہیں کہ جو کبھی بدلتے نہیں اور جو تمام انسانوں میں یکساں طور سے کار فرما رہے ہیں اور آئندہ بھی رہیں گے۔ یہ صرف ظاہری حالات اور عارضی کیفیات ہوتی ہیں جو ہر دور کی الگ الگ ہوتی ہیں اور آئندہ بھی ہوتی رہیں گی۔ اس لئے اگر ظاہر باتوں کا لحاظ کیا جائے تو جس طرح آج کا زمانہ پہلی صدی ہجری سے مختلف ہے اسی طرح پہلی صدی ہجری کا زمانہ دور عیسوی سے اور دور عیسوی دور موسوی سے بھی لازماً مختلف تھا۔ اب اگر اس اختلاف احوال کے باوجود تمام انبیاء نے یکساں طور پر ہمیشہ براہ راست جدوجہد کی پالیسی اختیار کی۔ تو اس ظاہری اختلاف کے باوجود بھی جو ہمارے زمانے اور پچھلے زمانوں میں نظر آتا ہے ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم بھی یہی پالیسی اختیار کریں۔ کیونکہ اس کام کے لئے کوئی دوسرا طریقہ اپنایا ہی نہیں گیا اور تمام انبیاء کا اسی طریق کار کو اختیار کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس جدوجہد کا مزاج ہی براہ راست اقدام کا طالب ہے یہ دلیل یقین سے بڑھ کر ہم کو حق الیقین کی حد تک پہنچا دے سکتی ہے اگر اس میں تاریخ انبیاء کی یہ گواہی بھی شامل کر دی جائے کہ بعض انبیاء کو پھیر کی پالیسی اختیار کرنے کے بہتر سے بہتر مواقع ہاتھ آئے۔ مگر انہوں نے پوری صفائی اور طمانیت کے ساتھ ان کو ٹھکرا دیا۔ خود سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے قریش کی جس پیش کش کا

تذکرہ پچھلے صفحوں میں آچکا ہے غور فرمایئے اس نے اس پالیسی کا کیسا سنہری موقع فراہم کر دیا تھا؟ جب انہوں نے کہا کہ آپ کو ہم اپنا بادشاہ بنائے لیتے ہیں اور اس کے لئے ہم آپ سے یہ مطالبہ بھی نہیں کرتے کہ آپ اپنی "دعوت توحید" سے دست کش ہو جائیں۔ آپ سے ہماری صرف اتنی گذارش ہے کہ آپ ہمارے بتوں کی تردید اور تحقیر کرنے اور ہمارے دین کی عیب جوئی فرمانے سے باز رہیں .... تو آج کے اہل سیاست و تدبر کے نقطہ نظر سے یہ "پیش کش ایک" ایک نعمت غیر مترقبہ ہی تھی بلکہ اس کو ٹھکرا دینے کی بابت کچھ سوچنا بھی حرام مطلق سے کم نہ تھا انہیں اگر مشورہ دینے کا موقع ملتا تو ان کا مشورہ اس کے سوا اور کچھ نہ ہوتا کہ آپ اس پیش کش کو فورا" قبول فرمالیں۔ تاکہ اس سے ایک طرف تو ان مصیبتوں اور فتنوں کا بھی خاتمہ ہو جائے جو آپؐ اور آپؐ کے پیروؤں کی زندگی اجیرن کئے ہوئے ہیں دوسری طرف تخت حجاز پر قابض ہو چکنے کے بعد آپ اپنے حاکمانہ اثر و اقتدار سے کام لیتے ہوئے "حکمت" کے ساتھ اپنے دین کی جڑیں مضبوط کرتے جائیں۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ وہ پورے عرب پر قائم ہو جائے۔ مگر آپ کو معلوم ہے کہ پیغمبرعالم نے اس "سنہرے" موقع پر کیا طرز عمل اختیار کیا؟ اور اس پیش کش کا کیا جواب دیا؟ یہ کہ :-

ماجئت بما جئتکم به أطلب اموالکم ولا البشرف ولا الملک علیکم فبلغتکم رسالات ربی و نصحت لکم فان تقبلوا منی ماجئتکم به فهو حظکم فی الدنیا و الاخرة و ان تردوه علی اصبر لامر الله حتی یحکم بینی و بینکم (ابن ہشام - جلد ۱)

میں تمہارے پاس جو پیغام لے کر آیا ہوں اس سے میری غرض یہ نہیں ہے کہ اس کے ذریعہ تمہاری دولت حاصل کر لوں یا جاہ و عظمت کا مالک بن جاؤں یا تمہارا بادشاہ بن جاؤں۔ سو میں نے تمہیں اپنے رب کے پیغام پہنچا دیئے اور تمہاری خیر خواہی کا حق ادا کر دیا۔ اب اگر تم میری دعوت کو مان لیتے ہو تو وہ تمہارے لئے دنیا و آخرت میں باعث خیر و برکت ہو گی اور اگر اسے رد کر دیتے ہو

تو میں پوری مضبوطی سے اپنے کام میں لگا رہوں گا یہاں تک کہ میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ کردے۔

یہ کسی جوشیلے اور جذبات کی رو میں بہنے والے انقلابی نوجوان کے الفاظ نہ تھے بلکہ اس معلم حکمت و دانش کے الفاظ تھے۔ جس کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ اس کے دل اور زبان پر خدا کی نگرانی قائم تھی اور جس نے کبھی کوئی بات جذبات سے بے قابو ہو کر نہیں کی۔ اس لئے ایک مومن تو اس وہم کو اپنے قریب بھی نہ پھٹکنے دے گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پیش کش کا حق نہیں پہچانا اور ایک ایسے طریق کار کے ہاتھ آتے ہوئے بھی اسے عمداً "ترک کردیا" جو حصول مقصد کے لئے راست جدوجہد سے زیادہ موزوں اور کارگر تھا۔ یا یہ کہ آپ میں نعوذ باللہ آج کے نام نہاد مدبروں جیسی بھی انجام بینی نہ تھی کہ ماحول اور زمانے کے تقاضوں کا اندازہ کرسکتے اور اس کے نتیجے میں اس پالیسی کو اختیار کر لیتے۔ ایسا کوئی گمان بھی مسلمان کے لئے ممکن نہیں اب اگر آپ نے موقع ملنے کے باوجود دعوت حق اور اقامت دین کا براہ راست طریقہ ترک نہیں کیا تو یہ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ پھیر کا راستہ اختیار کرنا کسی اور "حکمت و دانش" کے مطابق ہو تو ہو مگر نبوی حکمت و دانش کے مطابق ہرگز نہیں ہے۔

خالص عقلی حیثیت سے بھی دیکھئے تو اس طرز فکر اور اس نظریئے میں بیلہ جوئیوں' خوش گمانیوں اور خود فریبیوں کے سوا کچھ نظر نہ آئے گا۔ پھیر کے راستے اختیار کرنے کے معنی یہی تو ہیں کہ ایک زمانے تک حق کو باطل نما بنا کر پیش کیا جائے' اور جس باطل میں مسلمان گھرا ہوا ہے اس سے نکل کر حق کی طرف بھاگنے کی بجائے ایک دوسرے باطل کے سائے میں جا کھڑا ہو۔ کیونکہ اگر وہ موجودہ باطل کو درہم برہم کرکے ایک ایسا ماحول قائم کرنے کی کوشش کرے گا جو حق نہ ہو تو وہ لازماً" باطل ہی ہو گا۔ جس کا رنگ و روغن تو نیا ضرور ہو گا مگر اصل فطرت اس کی بھی بہرحال وہی ہو گی جو موجودہ باطل کی ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ ہم اس پراثر ڈال کر اپنے نصب العین

کے لئے نسبتاً" زیادہ سازگار بنا لیں گے مگر افسوس ہے کہ دنیائے عمل میں اس خام خیالی کی کوئی قیمت نہیں۔ کیونکہ باطل خواہ کوئی قالب اختیار کرے وہ حق کے لئے بھی سازگار نہیں ہو سکتا اور اگر اس میں حق کے کچھ پیوند آپ بہ ہزار وقت لگا بھی لیں گے تو بھی وہ آپ کے اصل مقصد کے لئے خالص باطل سے کم مضر ثابت نہ ہو گا۔ دور نہ جائیے' اسی ہندوستان میں بہت سی اسلامی ریاستیں قائم ہیں جن میں کم و بیش وہ تمام باتیں موجود ہیں جن کا آپ آئندہ نظام ملکی میں جوڑ لگانا چاہتے ہیں مگر وہاں اقامت دین کا نام ہی لے کر دیکھئے زندگی عذاب بنے بغیر نہ رہ سکے گی۔ آپ اپنی اس جدوجہد میں غیر ملکی حکومت ہی کو سدراہ سمجھتے ہیں اور اسی لئے اس کے ہٹ جانے کا انتظار کر رہے ہیں۔ مگر آپ شاید بھولتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ کے مشن کے متعلق رومی اقتدار بھی خاموش ہی تھا کہ ان کی اپنی ہی قوم' یا یوں کہئے کہ اس وقت کے "مسلمانوں" ہی نے بڑھ کر اس کی مشکیں کس دیں۔ پھر اپنی حال کی تاریخ پر نظر ڈالئے۔ شیخ جمال الدین افغانی نے ایک ایسی تحریک اٹھائی جو صرف فی الجملہ دینی تحریک تھی' مگر آپ کی انہی موجودہ "اسلامی" حکومتوں نے ان کو رہنے کے لئے جگہ دینے تک سے انکار کر دیا اور اگر آج بھی کسی کو ہمت ہو تو ان ممالک میں یہ آواز اٹھا کر قدر عافیت معلوم کر سکتا[1] ہے۔

---

(۱) یہ الفاظ اس وقت لکھے گئے تھے جب لا الٰہ الا اللہ کی بنیاد پر قائم کی جانے والی "مملکت خداداد پاکستان" ابھی وجود میں نہیں آئی تھی۔ وجود میں آچکنے کے بعد اس کے ناخداؤں نے وہاں کی اسلامی تحریک کے ساتھ جو کچھ کیا اور پھر چاہنے کے باوجود جو کچھ وہ کر نہ سکے وہ سب کے سامنے ہے۔ اسی طرح مصر کی فوجی حکومت نے وہاں کے اسلام پسندوں کے ساتھ جس بربریت کا سلوک کیا وہ اس تلخ حقیقت کی سب سے زیادہ نمایاں اور عبرتناک مثال ہے۔

درحقیقت یہ دفع الوقتی کی باتیں ہیں اور یہ نظریہ اسی ذہنیت کی پیداوار ہے جس نے دعوت قرآنی کے جواب میں حالات کی "ناسازگاریوں" سے گھبرا کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مطالبہ کیا تھا۔ اِئتِ بِقُرآنٍ غَیرِ ھٰذَا اَو بَدِّلہُ یعنی اس کے بجائے کوئی اور قرآن لایئے یا پھر اس میں کچھ ایسی ترمیمیں کر دیجئے۔ جن کے بعد وہ ہماری خواہشوں کے ساتھ اور زمانہ و ماحول سے ہم آہنگ ہو جائے۔ اس طرز پر سوچنے والوں کی نگاہ شاید اس طرف نہیں جاتی کہ دنیا کے ہنگامے جیسے آج ہیں کل بھی ویسے ہی رہیں گے' اور جو مصالح اور مشکلات آج ان کا راستہ روک رہی ہیں آئندہ بھی ان میں کوئی کمی رونما نہ ہو گی۔ اس لئے اس پالیسی کا حاصل صرف یہ ہو گا کہ نہ کبھی پھیر کے راستے اختیار کرنے کے اسباب محرکات ختم ہوں گے نہ اقامت دین کے لئے براہ راست جدوجہد کی کبھی نوبت آ سکے گی[1]۔

---

(۲) جس وقت یہ الفاظ لکھے گئے تھے اس وقت تک یہ بات بھی محض ایک قیاس کی حیثیت رکھتی تھی لیکن تقسیم ہند کے بعد سے لے کر اب تک کی تاریخ اسے بھی ایک حقیقت واقعی ثابت کر چکی ہے آزادی سے پہلے ہمارے جہاندیدہ ارباب دین و سیاست بڑی بزرگانہ شان سے فرمایا کرتے تھے کہ اس وقت یہاں انگریز اپنے پنجے گاڑے ہوئے ہے۔ پہلے اسے اکھاڑ دو' پھر آزادی کی فضا میں اس کام کو یکسو ہو کر کیا جائے گا مگر آج آزادی کی کھلی فضا میں بھی یہ مبارک زبانیں اس طرح بند ہیں کہ حال تو حال' مستقبل بعید کے بارے میں بھی کوئی کلمہ تشفی سنانے کی جرات نہیں ہو رہی ہے۔

۳۔ کلی اور ابدی مایوسی

حیرت انگیز حیا کشی

تیسرا گروہ جو کچھ کہتا ہے' اس کے سوچنے کا جو انداز ہے اور اس کے جو دلائل ہیں' وہ سب قریب قریب وہی ہیں جو دوسرے گروہ کی زبانی گزشتہ بحث میں آپ سن چکے ہیں۔ اس لیے انہیں دوبارہ نقل کرنے اور ان کی غلطی واضح کرنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ ایک حیثیت سے یہ لوگ ان سے مختلف ضرور ہیں اور وہ یہ کہ فرض ناشناسی اور مقصد فراموشی کی جو بیماری وہاں سیاسی دور اندیشی اور زمانے کی مصلحتوں کے پردے میں چھپادی گئی تھی۔ یہاں وہ صاف گوئی اور جرات کے ساتھ ظاہر کر دی گئی ہے اس لیے ان لوگوں کے ظاہرو باطن کی ہم رنگی کا اعتراف کرنا پڑے گا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس ایمانی بے غیرتی کا تصور' جو اس صاف گوئی اور جرات اظہار کے پیچھے کام کررہی ہے دل پر بڑی سخت چوٹ لگاتا ہے۔ اور کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا ان لوگوں نے اپنے جسم سے کپڑے اتار کر پھینک دیئے ہیں۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ان میں کتنوں نے یہ حیا کشی ہوش اور بیداری کے عالم میں کی ہے اور کتنوں نے غفلت اور بے ہوشی کی حالت میں؟ ایک طرف تو اقامت دین کی اس اہمیت کو دیکھئے کہ اس کے بغیر مسلمان کا کوئی موقف ہی باقی نہیں رہ جاتا؟ دوسری طرف ان حضرات کا یہ ارشاد سنئے کہ یہ نصب العین ہے تو بالکل برحق۔ مگر ہم جیسے کمزور لوگوں کے بس کا یہ کام نہیں ہے۔ جس مشن کو پیغمبرؐ کی تربیت یافتہ جماعت بھی تیس برس سے زیادہ نہ چلا سکی۔ اس کے لیے ہم جیسے ضعیف الایمان لوگوں کا دم خم دکھانا تقدیر سے لڑنا ہے۔ اب وہ زمانہ واپس نہیں آسکتا جو تیرہ سو برس پہلے گزر چکا ہے اس ارشاد کا ظاہر یقیناً" بڑا عاجزانہ ہے مگر تہ میں اتر کر دیکھئے تو یہ عاجزانہ نہیں بلکہ باغیانہ نظر آئے گا۔ جب اقامت دین کی جدو جہد سے ازخود کنارہ کش ہو کر اور باطل و منکر کے ساتھ عدم تعرض کی پالیسی اختیار کر کے انسان پیروان اسلام کی صف پائیں میں بھی جگہ نہیں پاسکتا

اور اللہ کے رسولؐ نے ایسے شخص کو ایمان کے آخری درجہ سے بھی محروم قرار دیا ہے تو سوچنے کی بات ہے کہ بڑی سے بڑی کمزوری اور مایوسی بھی اس فرض کی انجام دہی سے بے تعلق ہو جانے کا کوئی حق کیسے دلا سکتی ہے؟ اگر کہیں فی الواقع یہ بے تعلقی ہے تو ماننا پڑے گا کہ کسی کمزور سے کمزور ایمان کی تلاش بھی یہاں بے سود ہے۔ اسلام نے اپنا کوئی "سستا ایڈیشن" شائع نہیں کیا ہے جس کے تحت اس "دم خم دکھانے" سے نجات ممکن ہو۔ جو شخص دھوکے میں ہے وہ یہ سمجھ بیٹھا ہے کہ اس قطعی لازمہ ایمانی سے بے بہرہ رہ کر بھی ایمان اور رضائے الٰہی کی کوئی مقدار حاصل کی جا سکتی ہے۔

تاریخ خلافت کا "استدلال"

اس طرزِ فکر کی بنیادوں میں سب سے زیادہ اہمیت اور مرکزیت جس چیز کو حاصل ہے اور جو ایک نئی "دلیل" کی حیثیت بھی رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ جو چیز صحابہؓ کے ہاتھوں بھی تیس برس سے زیادہ پوری طرح قائم نہ رہ سکی۔ اس کے لیے اب کوئی سعی بالکل لاحاصل ہے۔ یہ "دلیل" ان معنوں میں "یقیناً" ایک زبردست دلیل ہے کہ اس کا عام لوگوں کے حوصلوں پر بڑا مرعوب کن اثر پڑتا ہے۔ چنانچہ واقعات شہادت دیتے ہیں کہ مسلمانوں کے اندر مایوسی اور دل شکستگی کا زہر پیدا کرنے میں اس خیال نے جتنا موثر پارٹ ادا کیا ہے اس کا اندازہ بھی مشکل ہے لیکن یہ بات کہ یہ "دلیل" واقعتاً" بھی دلیل ہے اور وہ عام جذبات ہی کو متاثر نہیں کرتی بلکہ عقل سے بھی اپنا وزن تسلیم کرا سکتی ہے، حقیقت سے بالکل دور ہے کیونکہ اس استدلال میں جس چیز کو

---

(۱) اس موقع پر "کامیابی کا اسلامی تصور" اور "مومن کی اصل ذمہ داری" وغیرہ بحثوں کو جو پچھلے صفحات میں گذر چکی ہیں۔ ذہن میں رکھنا چاہیے۔ ورنہ یہاں اس اجمالی گفت گو سے غلط فہمی پیدا ہو جانے کا احتمال ہے۔

بنیاد قرار دے کر اقامت دین کے فریضے کو اپنے حق میں ساقط سمجھ لیا گیا ہے اس کا اس فریضے کی ادائیگی سے فی الواقع کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ کسی اصول اور نصب العین پر جب آپ ایمان لا چکے تو اس کے مطالبات آپ کو بہر حال پورے کرنے پڑیں گے۔ اور اس بات کا آپ کی ذمہ داری پر ہرگز اثر نہیں پڑ سکتا کہ اسے کبھی ایک لمبے عرصے تک نافذ العمل نہیں رکھا جاسکا ہے۔ اور اگر اس بنیاد پر کسی نے اپنی ذمہ داری کو ادا کرنا چھوڑ دیا تو یہ اس کے قول و عمل کے تضاد کی ایک بدترین مثال ہوگی۔ سوچنا چاہئے کہ ہم نے اسلام کی علم برداری آیا اس لیے قبول کر رکھی ہے کہ وہ فی نفسہ حق ہے، یا اس کا کوئی اور سبب ہے؟ اگر کوئی اور سبب ہے تو پھر ہم پر دینی اور اخروی جہت سے اس کا کوئی مطالبہ واجب ہو ہی نہیں سکتا نہ ہم پر اس کے لیے کسی جدو جہد کے ترک کر بیٹھنے کا الزام لگ سکتا ہے لیکن اگر پہلی بات ہے، جیسا کہ ایک ایک مسلمان کے بارے میں توقع کی جانی چاہئے تو ایک غیر مسلم بھی تاریخ خلافت کی آڑ لینے میں ہمیں حق بجانب نہیں قرار دے سکتا۔ تیس اور چالیس برس تو درکنار، اگر یہ نظام اپنی اصل اور معیاری شکل میں کامیابی کے ساتھ کبھی ایک دن بھی قائم نہ رہ سکا تو ہوتا تو بھی اس کے قائم کرنے کی ہماری ذمہ داری اپنی جگہ جوں کی توں باقی ہی رہتی اور اس کے لئے سر دھڑ کی بازی بہر حال لگانی ہی پڑتی۔ جب ہم نے اس کو حق مانا اور اس کی علمبرداری کا دعویٰ کیا ہے تو ہمارے لئے یہ دیکھنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی کہ اس راہ میں کس نے کیا کیا اور کب کیا گیا؟ اب ہمارے فرائض کی تعیین وہ نصب العین کرے گا جس کو حق سمجھ کر ہم نے قبول کر رکھا ہے، تاریخ نہیں کرے گی۔

غالباً" اس نام نہاد دلیل کے قریب ترین منطقی نتائج پر بھی غور نہیں کیا گیا۔ ورنہ اتنی غلط بات منہ سے نہ نکالی جاتی۔ اگر اقامت دین کی جدوجہد کے بارے میں اس طرح کے صغریٰ کبریٰ سے کام لینا صحیح ہے تو آیئے یہ بھی دیکھ لیجئے کہ یہ منطق ہمیں کہاں پہنچا دیتی ہے؟ آپ نے پڑھا ہو گا کہ کتاب و سنت میں ایک مثالی مومن کی فلاں فلاں صفات بیان ہوئی ہیں اور یہ کہ اللہ و رسولؐ نے معیاری ایمان و اسلام کا بڑا

اونچا تصور پیش کیا ہے اتنا اونچا تصور کہ اس پر پورے اترنے والے انسان ابوبکر صدیقؓ عمر فاروقؓ، عثمان غنیؓ، علی مرتضیٰؓ، ابوذر غفاریؓ، سلمان فارسیؓ، صہیب رومیؓ، بلال حبشیؓ اور انہی کی طرح کے چند سو یا چند ہزار نفوس سے زیادہ نہیں پیدا ہو سکے اور اس وقت تو اس معیار کا مسلمان شاید ڈھونڈھنے سے بھی نہ ملے۔ تو اب ذرا اسی منطق سے، جس نے خلافت راشدہ کے مثالی اور معیاری دور کا حوالہ دے کر ہم کو اقامت دین کی جدوجہد سے دور ہی رہنے کی ہدایت کی ہے معیاری مسلمان بننے کی خواہش اور کوشش بلکہ مطلقاً" مسلمان ہی باقی رہنے کی بابت بھی فتویٰ پوچھئے۔ اسے یقیناً" فتویٰ یہی دینا پڑے گا کہ اب ایسے معیاری ایمان کا ذکر اور خیال چھوڑ دینا چاہئے اور ان مطلوبہ مثالی صفات کے لئے کوشش بند کر دینا چاہئے۔ حتیٰ کہ مسلمان باقی رہنے کی خواہش بھی غلط ہو گی کیونکہ استدلال کو غلط نہیں سمجھتے تو اس دوسرے استدلال کو بھی رد نہیں کر سکتے۔ اگر خلافت راشدہ کی قلیل العمری اجتماعی اور سیاسی پہلو سے ہمیں اس امر کا حق دلا سکتی ہے کہ اب قیامت تک کے لئے قیام دین کے تصور سے ذہنوں کو خالی کرلیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ تدین و تقویٰ کے سلسلے میں اس "استحقاق معذرت" کو قبول نہ کیا جائے۔ لیکن عجیب ماجرا ہے کہ اگرچہ اب ایک "ابوبکرؓ" بھی پیدا نہیں ہو رہا ہے مگر ایک شخص بھی صدیقی اور فاروقی ایمان کے حصول سے مایوس ہو کر اسلام سے علیحدگی پر، یا معیاری ایمان کی خواہش اور کوشش سے دست برداری پر تیار نہیں۔ اس کے بخلاف ہو یہ رہا ہے کہ خود بھی اوپر اٹھانے کی کوششیں معیاری ہیں اور دوسروں کو بھی اچھا مسلمان بنانے کے لئے تبلیغی انجمنیں قائم کی جاتی ہیں۔ اشاعت دین کے ادارے کھولے جاتے ہیں تعلیم کتاب و سنت کے لئے درسگاہیں جاری کی جاتی ہیں۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ صدیقؓ و فاروقؓ کی سی اسلامیت کے حصول سے مایوس ہونے کے باعث اسلام کا نام لینا چھوڑ دیا جاتا؟ اس کے جواب میں آخر یہی تو کہا جائے گا نا کہ ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ اسلام کے اعلیٰ اور مثالی نمونے تھے۔ ان کے جیسا ایمان و تقویٰ اگر ہم اپنے اندر پیدا نہیں کر سکتے تو اس

کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سرے سے اسلام ہی چھوڑ دیں بلکہ ہمارے کرنے کا کام یہ ہے کہ ان نمونوں کو سامنے رکھ کر اپنی استطاعت کے مطابق پوری کوشش کریں اور جہاں تک ہو سکے۔ اسی طرح کا تدین پیدا کرنے کی فکر میں برابر لگے رہیں۔ تاریخ نے ہمارے سامنے اسلام کے یہ اعلیٰ ترین نمونے رکھ دیئے ہیں تاکہ وہ ہمارے لئے معیار اور مثال کا کام دیں اور ہم میں سے جسے جتنی توفیق ملے اپنے آپ کو ان کا ہم رنگ بنانے کی کوشش کرتا رہے اور جس مقام پر وہ تھے اس کی طرف جتنے قدم بڑھا سکتا ہے بڑھاتا رہے۔ سوال یہ ہے کہ یہی بات اقامت دین کے سلسلے میں بھی کیوں نہیں سوچی اور کہی جاتی! اس اصولی بات کو ایمان و عمل کے ایک محدود دائرے ہی تک کیوں محدود کرلیا جاتا ہے۔ اس کے اطلاق کو کیوں نہیں وسیع تر مسائل تک پھیلنے دیا جاتا؟ یقیناً اس تحدید کی کوئی معقول وجہ نہیں ہو سکتی۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس اصولی نقطہ نگاہ سے آپ خلافت راشدہ سے تعلق رکھنے والی اس بحث کو بھی دیکھیں۔ حضرات ابوبکر و عمر اور عثمان و علی رضوان اللہ علیہم کی انفرادی زندگیوں کی طرح ان کا طرز خلافت بھی ایک معیاری اور مثالی نمونے کے کام دیتا رہے اور جس حد تک ان کے دست و بازو میں خدا نے توانائی بخشی ہو اس نمونے کے اتباع میں برابر کوشاں رہیں اور اس وقت تک اطمینان کا سانس نہ لیں جب تک کہ ان کا قائم کیا ہوا نظام اس نمونے کا عکس نہ بن جائے' ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ ان پاکان خاص کا ایمان و تقویٰ انفرادی زندگیوں میں ہمارے لئے ایک ایسا معیاری نمونہ ہے جسے سامنے رکھ کر ہمیں اپنے ایمان و تقویٰ کو مسلسل فروغ دینے کی پوری پوری کوشش کرنا ضروری ہے۔ اس سعی و کوشش میں جس حد تک کامیابی ہو جاتی ہے اسی حد تک ہم مکلف اور مسئول بھی ہیں اور اسلام کو اس کے صحیح رنگ میں جس حد تک قائم کر سکتے ہیں اسے دین اللہ کا قیام ہی کہا جائے گا۔ جس طرح ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ بن جانا ہم پر فرض نہیں۔ بلکہ ان کے کامل نمونوں کو سامنے رکھ کر حتی الامکان ان سے بیش از بیش مماثلت پیدا کرنا ہی ہمارا فریضہ ہے اسی طرح ہر حال میں انہی جیسی معیاری

خلافت کا قائم کر دینا ہماری ذمے داری نہیں ہے۔ ہماری اصل ذمے داری صرف یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے ان کی قائم کی ہوئی خلافتوں سے زیادہ سے زیادہ مشابہت رکھنے والا اجتماعی نظام قائم کرنے کی پوری سعی کریں' اور آگے آنے والی نسلیں یکے بعد دیگرے اس مشابہت کے رنگ کو اور زیادہ نکھارتے رہنے کی کوشش کرتی رہیں۔

اس لئے اس تیس سالہ دور خلافت کو اپنے لئے مثل اور اسوہ بنائیے اور اس کی بلندیوں سے دہشت کھا کر بھاگ کھڑے ہونے کے بجائے اس سے درس عمل لیجئے۔ انسانیت کا یہ دور سعادت اقامت دین کی جدوجہد پر ابھارنے والی چیز ہے نہ کہ اس سے بد دل کرنے والی۔ اگر اس کے نام سے دلوں میں مایوسی اور افسردگی کی لہریں اٹھیں۔ اس نام میں تو بلا کی کشش' اور اس کشش میں طوفان کا سا جوش بھرا ہوا ہے۔ اگر مسلمان کا یقین ہے کہ انسانیت کی فلاح صرف دین حق کے قیام ہی سے وابستہ ہے اور اگر اس کا سینہ اس مبارک زمانے کی سچی قدر و محبت سے خالی نہیں ہوگیا ہے جس میں خدا کی مرضی زمین پر بھی اسی طرح پوری ہو رہی تھی جس طرح کی آسمان پر پوری ہوتی رہتی ہے تو اس یقین اور اس قدر و محبت کا فطری تقاضا ہے کہ دل اس گزری ہوئی خوشگوار حقیقت کو واقعات کی دنیا میں پھر سے کارفرما دیکھنے کے لئے مسلسل بے قرار رہے جس شخص کے ایمان میں یہ بے قرار روح نہ ہو وہ دراصل ایمان ہی نہیں بلکہ ٹھنڈے تصورات کا ایک بت کدہ ہے۔

اسلامی نظام کے متعلق ایک شدید غلط فہمی

اوپر کی سطروں میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس سے فی نفسہ یہ خیال ہی غلط ثابت ہو جاتا ہے کہ اسلامی نظام صرف تیس سال قائم رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ عجیب و غریب خیال کچھ ٹھوس علمی اور تاریخی حقائق سے پیدا نہیں ہوا ہے بلکہ اسے بالقصد پیدا کیا گیا ہے اس خیال کے پیدا کرنے میں چالاک دشمنوں کی عیاری اور نادان دوستوں کی سادہ لوحی دونوں ہی شامل ہیں۔ امرواقعہ صرف یہ ہے کہ جس طرح حضرت ابوبکرؓ

اور حضرت عمرؓ کے بعد بھی مسلمان پیدا ہوئے اور برابر ہوتے رہے اس طرح ان کی خلافتوں کے بعد بھی مدتوں اسلامی نظام قائم رہا فرق صرف یہ تھا کہ جس طرح ان حضرات کی شخصیتیں بے داغ تھیں۔ اسی طرح ان کی خلافتیں بھی خیر کامل کا نمونہ تھیں اور جس طرح بعد میں آنے والی شخصیتیں ناقص تھیں اسی طرح ان کے وقت کا طرز خلافت بھی ناقص تھا۔ شخصیتوں کا ناقص ہونا اگر کسی حال میں بھی ان کے غیر مسلم ہونے کے ہم معنی نہیں تو اس طرز خلافت کے ناقص ہونے کے معنی بھی یہ نہیں ہو سکتے کہ یہ خلافتیں غیر دینی اور ان کا زیر عمل نظام غیر اسلامی تھا۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ جس طرح مسلم افراد میں اسلامیت کے مدارج مختلف ہوتے ہیں اسی طرح کتاب و سنت کو اصل ماخذ قانون تسلیم کرکے چلائے جانے والے سیاسی نظاموں کے بھی مدارج مختلف ہوتے ہیں۔ جس طرح اشخاص میں کمزوریاں ہوتی ہیں اسی طرح اسٹیٹ میں بھی ہوتی ہیں۔ چنانچہ خود اس تیس سالہ خلافت راشدہ کے سب دور بھی اپنی روح میں یکساں نہ تھے۔ بلکہ عثمانی اور علوی خلافتیں صدیقی اور فاروقی خلافتوں سے کم معیاری تھیں جس پر احادیث اور تاریخ دونوں شاہد ہیں اس لئے جب ہم افراد کی کمزوریوں پر تنقید تو کرتے ہیں مگر ان کو دائرہ اسلام سے خارج نہیں سمجھتے تو اس تیس سالہ دور خلافت کے بعد قائم رہنے والے سیاسی ڈھانچوں پر بھی سخت سے سخت تنقید تو کی جاسکتی ہے اور ان کو جاہلیت کے عناصر سے مخلوط بھی کہا جاسکتا ہے۔ مگر انتہائی زیادتی ہوگی اگر انہی بالکلیہ غیر اسلامی اور جاہلی قرار دے دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جس طرح علمائے حق بد عمل مسلمانوں کی ہدایت و تذکیر کا فرض ادا کرتے آئے ہیں۔ اسی طرح وہ ان ناقص حکمرانوں کی غلط کاریوں پر ضرور ٹوکتے رہے اور ان کے طرز حکومت کے نقائص پر اظہار نکیر کرتے ہوئے ان کی اصلاح کی برابر کوششیں کرتے رہے ہیں مگر اس سے آگے بڑھ کر انہوں نے ان کے خلاف یہ فتویٰ کبھی صادر نہیں کیا کہ یہ حکومتیں سراسر غیر اسلامی اور کافرانہ ہے۔ غرض خلافت راشدہ کے بعد بھی مدتوں جو سیاسی نظام اسلامی ممالک میں جاری رہے جو کم و بیش اسلامی ہی تھے۔ عدالتیں اسلامی قانون کے

مطابق فیصلے کرتی تھیں سزائیں احکام شریعت کے تحت دی جاتی تھیں۔ جائدادیں دینی ضوابط کی رو سے تقسیم کی جاتی تھیں۔ مختصر یہ کہ جو کچھ خرابی تھی حکمرانوں کے طرز انتخاب میں اور ان کی ذات میں تھی ورنہ جہاں تک زندگی کے عام معاملات کا تعلق ہے اقتداری کتاب و سنت ہی کو حاصل تھی اور اس کے گوشے گوشے پر نظام دین کی بالادستی بدستور چھائی ہوئی تھی۔ حتیٰ کہ خراب سے خراب حکمران بھی اپنی کوئی غیر اسلامی کاروائی انجام دینے کے لئے اس بات پر مجبور تھا کہ چہرے پر تشرع کی نقاب ڈال لے اور اس بات کا وہ تصور تک نہیں کر سکتا تھا کہ خدا کے دین اور قانون کی جگہ اپنا دین اور قانون چلا دے۔

غلط فہمی نہ ہو اس تقریر کا منشا یہ نہیں ہے کہ ان تمام حکومتوں کو خالص اسلامی حکومت قرار دے دیا جائے' جو خلافت راشدہ کے بعد قائم ہوتی رہی ہیں اور نہ اقامت دین کا فریضہ یاد دلانے کا یہ مقصد ہے کہ معتصم باللہ یا ہارون رشید کی طرح کوئی نظام حکومت قائم کرنے کی دعوت دی جا رہی اور اس پر مطمئن ہو جانے کی تلقین کی جا رہی ہے۔ بلکہ اس کا منشا صرف یہ بتانا ہے کہ خلافت راشدہ کا دور ختم ہو جانے کے بعد بھی اللہ کا دین ایک لمبی مدت تک دنیا میں قائم و نافذ رہا۔ اگرچہ جس انداز میں وہ قائم و نافذ تھا وہ اپنے مظاہر کے اعتبار سے بھی مگر ان تمام نقائص کے باوجود اس کے بحیثیت ایک اسلامی نظام کے قائم و نافذ رہنے کی نفی ہرگز نہیں کی جا سکتی۔ اس لئے یہ پروپیگنڈہ کرنا کہ یہ نظام صرف چند دنوں قائم رہا۔ ایک علمی بددیانتی اور تاریخ سے بہت بڑی فریب کاری ہے۔ اس کا مقصد یا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ اسلام اور اسلامی نظام سے لوگوں میں بدگمانی پیدا کر دی جائے۔

اسلامی نظام سب سے زیادہ عملی نظام

جو لوگ خلافت راشدہ کو دوسرے لفظوں میں اسلامی نظام کے معیاری قیام و نفاذ کی' قلیل العمری کو اس بات کی دلیل بناتے ہیں کہ اپنی داخلی نوعیت ہی کے اعتبار

سے اب ایک ناممکن العمل نظام ہے انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ اسلام کے مقابلے میں وہ کون سا نظام ہے جو اپنے نظریاتی معیار کے مطابق اس سے زیادہ مدت تک قائم اور نافذ رہ سکا ہے؟ اگر وہ بتانا بھی چاہیں گے تو شاہی یا آمریت کا نام تو بہرحال نہ لیں گے کیونکہ یہ دراصل نظام ہی نہیں اور اگر وہ نظام ہیں تو بھی ایسے نظام ہیں جن کی بنیاد جنگل کے آئین پر ہوتی ہے اور جس کو پوری انسانیت متفقہ طور سے رد کر چکی ہے۔ اس لئے لے دے کر وہ صرف جمہوری اور اشتراکی نظاموں کا نام لے سکتے ہیں جن کا کہ آج پوری دنیا پر سکہ چل رہا ہے اور جن کی مدح و منقبت میں اپنے اپنے کیمپ سے بہت کچھ کہا جاتا رہا ہے۔ لیکن ہمیں نہیں معلوم کہ آج تک ان کے بارے میں یہ دعویٰ کیا گیا ہو کہ وہ کبھی' تیس سال نہیں' تیس مہینے' بلکہ تیس دن بھی اپنے معیاری رنگ میں قائم اور نافذ کئے جا سکے ہیں۔ اس کے بخلاف تاریخ و سیاست کا پورا لٹریچر اس بات کے اعتراف سے بھرا پڑا ہے کہ جمہوریت ہو یا اشتراکیت کوئی بھی عملاً" اپنے نظریاتی معیار تک نہیں پہنچ سکی ہے اور کتابوں میں درج نظریات واقعات کی دنیا میں اپنا کوئی وجود نہیں رکھتے۔

جمہوریت کے بارے میں مشہور مفکر برنارڈشا کہتا ہے کہ :۔

"اس مقصد کے حصول میں ایک ایسی مشکل حائل ہے جو تقریباً" ناقابل حل ہے اور وہ یہ خوش فہمی ہے کہ ہر فرد کو ووٹ دینے کا حق مل جانا جمہوریت کی کامیابی کی ضمانت ہے حالانکہ یہی وہ چیز ہے جس سے جمہوریت کے مقاصد قطعی طور پر فوت ہو جاتے ہیں۔ بالغ رائے دہندگی کا اصول جمہوریت کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ پڑھے لکھے اور اونچی فکر رکھنے والے لوگ جمہوریت چاہتے ہیں لیکن پولنگ اسٹیشنوں پر ان کی حیثیت ایک معمولی اقلیت کی ہوتی ہے۔"

اطالوی ریرمیزینی لکھتا ہے کہ :۔

"انسان بادشاہ کی شکل میں ایک ہو یا جمہوریت کی شکل میں زیادہ ہوں بات یکساں ہی رہے گی۔"

ڈین رنج صاف کہتا ہے کہ :۔

"ایک مکمل جمہوریت بھی اس حد تک جمہوری نہیں ہو سکتی جس حد تک نظریہ جمہوریت اسے جمہوری بتاتا ہے"

لارڈ برائس اور جمہوریت کے دوسرے بہت سے حامیوں نے اپنے کو اس اعتراف پر مجبور پایا ہے کہ :۔

"حقیقی جمہوریت کبھی بھی' اور دنیا کے کسی گوشے میں بھی معرض وجود میں نہیں آ سکی ہے"

رہی اشتراکیت' تو اس کا مقدمہ جمہوریت سے بھی زیادہ کمزور ہے حتیٰ کہ جو نکتہ اس وقت گفتگو کا موضوع ہے اس کی بحث میں وہ کسی ذکر کے قابل ہی نہیں' ہے یہ مخالفانہ پروپیگنڈے کی بات نہیں ہے بلکہ ایک تسلیم شدہ اور بدیہی حقیقت کا اظہار ہے۔ چنانچہ اگر وہ غرض و غایت سن لی جائے جو اس اشتراکیت کے پیش نظر ہے تو یہ حقیقت سورج کی طرح خود عیاں ہو جائے گی۔ اشتراکیت کے مشہور و مستند امام فریڈرک اینجلز کے بیان کے مطابق اشتراکی نظام کی غایت مقصود یہ ہے :۔

"ایک ایسے سماج کی تشکیل جس میں نہ مختلف طبقات ہوں گے نہ انفرادی بقاء کے لئے کش مکش ہو گی۔ انسان فطرت کا باشعور آقا ہو گا اپنی تاریخ خود بنائے گا۔ مجلسی اسباب اس کی اپنی مرضی کے مطابق نتائج پیدا کریں گے وہ احتیاج کی دنیا سے نکل کر اختیار کی دنیا میں داخل ہو چکا ہو گا اور ریاست و حکومت ماضی کی یادگاریں بن چکی ہوں گی۔" (سوشلزم)

آج اشتراکیت کو اقتدار حاصل کئے ہوئے تقریباً چالیس سال ہو چکے ہیں اور اس وقت وہ متعدد ملکوں میں داد حکمرانی دے رہی ہے مگر کیا کہیں بھی یہ نظریاتی سماج دکھائی دے رہا ہے؟ روس اس کا سب سے پہلا گہوارہ اور مضبوط قلعہ ہے مگر کیا کبھی کسی کی زبان سے یہ دعویٰ سنا گیا ہے کہ وہاں نہ طبقات ہیں نہ احتیاج ہے' نہ ریاست ہے نہ حکومت ہے۔ اور ہر شخص اپنی تاریخ خود بنا رہا ہے! ظاہر ہے کہ جب وہاں یہ

سب چیزیں موجود نہیں ہیں تو ایسا پہاڑ جیسا جھوٹ کون بول سکتا ہے۔ چنانچہ اشتراکیت کے سارے حامیوں کا کہنا ہے کہ ابھی یہ نظام اپنے عبوری دور سے گزر رہا ہے۔ اور ارتقاء و تغیر کے متعدد مرحلے طے کر چکنے کے بعد اپنے اس نظریاتی معیار تک پہنچ گا۔ یہ بات کہ اشتراکی نظام آئندہ چل کر بھی اپنے دعوے اور وعدے کے مطابق ایسا سماج پیدا کر بھی سکے گا؟ اس وقت خارج از بحث ہے۔ اس وقت تو دکھلانا صرف یہ تھا کہ اشتراکیت ابھی تک' ایک دن کے لئے بھی اپنی معیاری شکل میں کہیں قائم اور نافذ نہیں ہو سکی ہے۔ یہ بات واقعات کو بھی تسلیم ہے اور اشتراکیت کے ایک ایک حامی اور علمبردار کو بھی۔

دوسرے نظاموں کے اس جائزے سے صورت واقعہ کیا قرار پائی؟ یہی نا کہ دنیا کے قابل ذکر نظاموں میں سے اگر کوئی نظام اپنے معیاری رنگ میں قائم اور نافذ ہو سکا ہے تو وہ صرف اسلامی نظام ہے۔ اس کے سوا دنیا کسی دوسرے ایسے نظام سے واقف نہیں جو تھوڑی مدت کے لئے بھی اپنا مثالی کردار پیش کر سکا ہو۔ اس لئے اگر کسی نظام کا معیاری قیام و نفاذ ہی اس کے قابل قبول ہونے کی دلیل ہے تو یہ دلیل صرف اسلام کے پاس ہے اور اس کی اس امتیازی حیثیت کو کوئی اور نظام چیلنج نہیں کر سکتا۔ اس حقیقت کی موجودگی میں یہ بات بھی کتنی عجیب بات ہو گی کہ اسلامی نظام کا قیام چونکہ بہت تھوڑے دنوں رہ سکا تھا اس لئے اب اسے دوبارہ قائم کرنے کی جدوجہد ایک فضول جدوجہد ہو گی۔

۴۔ تربص کا رویہ

اب ان حضرات کے افکار کا جائزہ لیجئے جو تربص کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں اور خود سلامتی و بے فکری کے محفوظ گوشوں میں بیٹھے ہوئے دوسروں کی ثابت قدمی اور تیزگامی کا حساب لگا رہے ہیں اور اسی کام کو اپنی زندگی کا اصل فریضہ کہنے کے باوجود

میدان عمل میں اس لئے نہیں اترتے کہ پہلے سے میدان میں اترے ہوئے لوگوں کی عزیمت انہیں مشکوک نظر آتی ہے۔

نفاق زدہ ذہنیت

اس انداز فکر کی لغویت پر عقل حیران ہے کہ کیا کہے؟ ایک چیز کو تسلیم تو فرض عین کیا جا رہا ہے مگر ساتھ ہی اس سے عملی تعلق کا یہ حال ہے کہ جب تک دوسرے اس کا حق ادا کر کے دکھا نہ دیں ہم اس کے لئے اپنی جگہ سے جنبش نہ دیں گے۔ یہ بالکل ایسی ہی بات ہے کہ اگر امام ان لوگوں کے خیال کے مطابق صالح اور متقی اور مقبول الصلوۃ نہ ہو تو یہ حضرات نہ صرف یہ کہ اس کے پیچھے ہی نماز پڑھنے سے انکار کر دیں گے بلکہ سرے سے نماز ہی چھوڑ بیٹھیں گے اور اپنے خیال میں کل' حشر کی عدالت میں یہ کہہ کر بری الذمہ ہو جائیں گے کہ خدایا! ہم تو نماز کو فرض عین ہی سمجھتے تھے اور چوبیس گھنٹے اس کے لئے با وضو رہتے تھے مگر موذن کی اذانوں اور امام کی نمازوں میں ہم کو خلوص و للہیت کی روح نظر نہیں آتی تھی۔ اس لئے ہم نے نماز نہیں پڑھی!کیا غور و فکر کے باوجود بھی اس طرز فکر و استدلال کے لئے کوئی شرعی یا عقلی بنیاد فراہم کی جا سکتی ہے؟ فرض کیجئے کہ زید اقامت دین کی دعوت دے رہا ہے اور ہماری فرض شناسیوں پر جھنجوڑ کر ہمارا فرض زندگی ہمیں یاد دلا رہا ہے نیز اپنے طور پر اس راہ میں قدم بھی رکھ دیتا ہے لیکن جہاں تک اس کی عملی صلاحیت' خلوص اور عزیمت کا تعلق ہے آپ کو اس پر پورا اطمینان نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ اور اس کے سارے ہم سفر آپ کو نا اہل' بے عمل' غیر مخلص اور غیر متقی دکھائی پڑتے ہیں .... تو سوال یہ ہے کہ ان کی یہ ساری خامیاں آپ کے اپنے فرض کو ساقط' اور آپ کو اپنی ذمے داریوں سے سبکدوش کس طرح کرا دیں گی؟ کیا آپ نے اس امر کو حق اس لئے مانا تھا کہ زید اور اس کے ساتھیوں کی یہی رائے ہے؟ کیا آپ نے دین حق کی اقامت کو اپنی زندگی کا اصل فریضہ اس شرط کے ساتھ تسلیم کیا تھا کہ پہلے زید اور اس کے ہمراہی ٹھیک ٹھیک ادائے فرض کا عملی ثبوت دے لیں۔ تب ہم اپنے نرم گرم بستروں سے اٹھیں گے اور اپنی آرام گاہوں سے قدم باہر نکالیں گے؟ کیا قرآن کی مرکزی دعوت پر لبیک کہنے کے آپ اسی طرح مکلف ہیں جب دوسروں کو اس کی (بقیہ

قربانیاں کرتے دیکھ لیں۔ اگر ایسا نہیں ہے .... اور قرآن گواہ ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہے .... تو خود اپنے نفس کی حیلہ سازیاں اور غفلتیں کیا کم ہیں کہ دوسروں کی کمزوریاں ٹٹولنے کی آپ کو فرصت مل جاتی ہے! دوسرے اگر فی الواقع ویسے ہی ہیں جیسا کہ آپ کا گمان ہے تو خدا کے روبرو اس کے جواب وہ وہ خود ہوں گے آپ اس کھود کرید کی زحمت' کہ کس کے اندر کیا ہے بلاوجہ کیوں اٹھائیں؟ ہر شخص کو صرف اپنے نامۂ اعمال کی فکر کرنی چاہئے۔ دوسروں کی ناقابل اطمینان حالت پر اگر نظر جائے تو صرف درس عبرت کے لئے کہ حکمت و دانش کا یہی تقاضا ہے۔ حضرت لقمان سے پوچھا گیا کہ "آپ نے ادب کس سے سیکھا؟" جواب دیا کہ "بے ادبوں سے"۔ مومن کو بھی اللہ تعالیٰ حکیم دیکھنا چاہتا ہے اور یہی عبرت پذیر اور حکمت پسند نگاہوں سے کام لینے کی اس نے اسے تاکید کی ہے۔ سارا قرآن اس نے مغضوب اور گمراہ قوموں کے تفصیلی تذکروں سے اسی لئے تو بھر رکھا ہے کہ مسلمان ان کی جیسی فکری اور غلط کاریوں سے اچھی طرح با خبر ہو رہیں (وَلِتَسْتَبِينَ سَبِيلُ الْمُجْرِمِينَ) اور ان سے ہمیشہ بچتے رہیں۔ اس لئے اس صورت حال کا مطالبہ کہ اقامت دین کا داعی شخص یا گروہ نا اہل کا مظاہر کر رہا ہے۔ ہم سے اگر کچھ ہو سکتا ہے تو صرف یہی کہ ان کی خامیوں' ظاہرداریوں اور غلط کاریوں کو اپنے لئے بے عملی کی سند بنا لینے کے بجائے ان سے خود اپنے دامن کو بچائیں اور پوری للہیت اور عزیمت کے ساتھ اس جھنڈے کو لے کر آگے بڑھیں۔ اس کے سوا اگر کوئی اور صحیح بات ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ ان کے لئے ہدایت' عزیمت' خلوص اور توفیق عمل کی دعا کرتے جائیں کہ ان کی چیخ و پکار اگرچہ ان کی اپنی حد تک محض "زبانی نعرہ اور بے جان دعویٰ" تھی۔ مگر ہمارے آپ کے حق میں تو وہی ہادی اور مذکر ثابت ہوئی۔ اس لئے فی الواقع وہ تو ہمارے اور آپکے شکریئے کے مستحق ہیں۔ نہ کسی طنز یا مخالفت کے اس نادان اور بدنصیب انسان پر جو تاریکیوں کے ہجوم میں سربراہ چراغ لے کر کھڑا ہو اور دوسروں کو تو ان کی منزل مقصود دکھا رہا ہو مگر خود اپنی آنکھوں پر اس نے پٹی باندھ

رکھی ہو۔ آپ کو افسوس تو ضرور آنا چاہئے۔ مگر اس پر بے دردانہ اعتراضات کرتے رہنا بے انصافی ہے اور اس کی پیروی کرتے ہوئے چراغ کی روشنی سے فائدہ اٹھانا حماقت اور بدبختی ہے۔ خوش بخت وہ ہے جو دوسروں سے عبرت اور نصیحت حاصل کرے۔ اور دانائی کا تقاضا یہ ہے کہ قائل کی شخصیت کے بجائے اس کے قول کو دیکھا جائے۔ "جو اللہ کی باتوں کو کان لگا کر سنتے ہیں اور پھران بہترین باتوں کی پیروی میں لگ جاتے ہیں" (اَلَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَہٗ زمر۔ ۱۸) دعوت اقامت دین" کے بارے میں اس طرح کی کوئی بحث تو ہے نہیں کہ وہ "القول" (اللہ کا قول) ہے یا نہیں؟ کیونکہ وہ مسلمہ طور پر "القول" ہے اس لئے بلا تامل اور بغیر توقف اس پر لبیک کہئے اور اگر ساری دنیا بھی اس کے اپنانے سے جی چرا رہی ہو تو بھی یقین رکھئے کہ اس سے آپ کی اپنی ذمہ داریوں میں کوئی کمی واقع نہیں ہو سکتی۔ اور نہ آپ کو یہ حق حاصل ہو سکتا ہے کہ دوسروں کے اخلاص و عزیمت کا انتظار کرتے رہیں۔ یہ انتظار تو حق پرستی کی ضد ہے اور جو شخص حق کو جان پہچان لینے کے بعد بھی انتظار کی پالیسی اختیار کرتا ہے وہ دراصل حق کی قدر ہی نہیں پہچانتا' اور اک گونہ اس کی راہ بھی روکتا ہے۔

بہت ضروری ہے کہ اس موقع پر اس رسوائے عالم گروہ کا حال اور انجام یاد کرلیا جائے جس نے رسولؐ اور اصحاب رسولؐ کی جاں فروشانہ دعوتی سرگرمیوں کے معاملے میں یہی پالیسی اختیار کر رکھی تھی۔ جس کے بلئے اس مہم میں شریک ہو جانے کے سلسلے میں یہ احساس فرض کافی نہ تھا کہ یہ لوگ جس کام کے لئے اپنی جانیں کھپا رہے ہیں اسی کو ہم نے بھی حق تسلیم کر رکھا ہے' بلکہ جو حق و باطل کی اس کش مکش سے دور کھڑے اس کے انجام کا اندازہ لگاتے رہتے تھے اور مسلمانوں کی جماعت میں صرف اس وقت آ ملتے تھے۔ جب ان کی فتح کے جھنڈے لہراتے دیکھ لیتے تھے۔

اَلَّذِیْنَ یَتَرَبَّصُوْنَ بِکُمْ فَاِنْ کَانَ لَکُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰہِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَکُنْ مَّعَکُمْ (نساء۔ ۱۴۱)

یہ لوگ تمہارے معاملہ میں انتظار کرتے رہتے ہیں اگر تمہیں اللہ کی طرف سے فتح مل جاتی ہے تو کہنے لگتے ہیں کہ کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں تھے؟

غور فرمایئے کہ جو لوگ اقامت دین کو اپنا حقیقی فریضہ کہتے ہوئے بھی محض دوسروں کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں اور اس کی خاطر کوئی عمل نہیں ہوتے۔ ان کی ذہنیت کتنی قریبی مشابہت رکھتی ہے اس ذہنیت سے جس پر ان منافقوں کے طرز عمل کی بنیاد تھی؟ جس طرح وہ "منافق" حق کی حمایت حق کی خاطر نہیں کرتے تھے اسی طرح ان "مسلمانوں" کے نزدیک بھی حق کا مجرد حق ہونا ہی آنکوگی عمل کے لئے کافی نہیں۔ فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ وہ لوگ مسلمانوں کی فتح کا انتظار کیا کرتے تھے اور یہ حضرات اقامت دین کے داعیوں کے عزم و اخلاص کے بارے میں کبھی "شرح صدر" کے منتظر ہیں لیکن اتباع حق اور ادائے فرض سے بھاگنے میں دونوں مشترک ہیں۔

ایک قدم اور آگے

کاش بات یہیں تک رہتی اور انتظار و تربص کے صرف اسی پہلو پر ہی اکتفا کر لیا گیا ہوتا۔ مگر یہ دیکھ کر صبر اور ضبط کا دامن سنبھالنا دشوار ہو جاتا ہے کہ لوگ اسی حد پر رکے رہنے کے لئے تیار نہیں۔ بلکہ خدا پرستی اتباع قرآنی اور عشق محمدی کی دعوے دار امت میں کچھ ایسے افراد بھی موجود ہیں جنہیں انتظار اس بات کا ہے کہ اقامت دین کے "جھوٹے مدعی" میدان سے کب بھاگ کھڑے ہوتے ہیں اور انہیں اپنے جذبات طعن و تشنیع کی تسکین دہی کا موقع کب نصیب ہوتا ہے۔ یہ حضرات ایک سنجیدہ تبسم کے ساتھ فرمایا کرتے ہیں کہ یہ ہوش سے عاری اور جوش کے اندھے لوگوں کا ایک گروہ ہے جو "قیام دین" "قیام دین" کا شور مچا رہا ہے۔ زمانے کے حوادث خود ہی اس کی فاتحہ پڑھ دیں گے۔ اور یہ فرما کر گویا اپنی ذمے داریوں کا حق ادا کر دیتے ہیں لیکن شاید انہیں خبر نہیں کہ ان کے اس نشتر طعن کی زد خود ان کی اپنی رگ گلو تک جا پہنچتی ہے۔ افسوس! مسلمانوں کا دل اب قیام دین کی مسرتوں سے بھی

اس درجہ محروم ہو گیا ہے کہ اگر خود نہیں کچھ کر سکتا تو دوسروں کا کچھ کرنا بھی اس کو گوارا نہیں رہا۔ آخر یہ باور کرنے کے لئے کہاں سے دل و دماغ لائے جائیں کہ جو سینہ دین حق کی محبت اور فدویت کا امین بنایا گیا تھا اب اس میں ان آرزوؤں کی پرورش کی جا رہی ہے جو صرف کفر اور فروغ کفر کے خلاف مخصوص ہونی چاہئے تھی۔ حالانکہ اگر کسی کے اندر اتنی غیرت اور ہمت موجود نہیں ہے کہ اللہ کے دین کو زندہ کرنے کے لئے قدم اٹھا سکے تو اس کے ایمان کا کم سے کم تقاضا یہ ہونا ہی چاہئے تھا کہ اس تمنا سے اپنے قلب و دماغ کو ایک لمحہ کے لئے بھی خالی نہ ہونے دیتا۔ اور اگر اللہ کے کچھ بندے اس کے لئے قدم اٹھا رہے ہوں تو ان کے لئے اخلاص عمل ثابت قدم نصرت حق اور حسن انجام کی دعائیں ہی کرتا رہتا۔ لیکن اگر کوئی اتنا بھی کر سکتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ غیرت حق کی آخری چنگاری بھی اس کے اندر بجھ رہی ہے اور اگر خدانخواستہ اس سے بھی آگے بڑھ کر وہ اس دعوت حق کو فتنہ قرار دے۔ لوگوں کو اس کی طرف بڑھنے سے روکنے لگ جائے اور اس کے لئے حوادث روزگار کی تمنائیں کرنے لگے۔ تو اس کی بدبختی کی یہ انتہا ہو گی اور ایسی صورت میں اس کو اسلام کا نام لیتے ہوئے شرم آنی چاہئے کیونکہ اس وقت وہ ذہنیت اور طرز اظہار کے تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ بالکل اسی مقام پر ہو گا جہاں سے کبھی کچھ بدنصیب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اولوالعزم ساتھیوں کے بارے میں ہلاکتوں کی راہ تکا کرتے تھے جس کا تذکرہ قرآن نے ان لفظوں میں کیا ہے۔

وَ مِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّ يَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ

(توبہ - ۹۸)

اور کچھ دیہاتی ایسے ہیں جو (اللہ کی راہ میں) کچھ خرچ کرتے رہتے ہیں اسے تاوان سمجھتے ہیں اور تم مسلمانوں کے حق میں آفات زمانہ کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔

یا پھر اس مقام پر جہاں سے پیغمبر عالم کی دلوں کو جیت لینے والی دعوت حق کو یہ

کہہ کر ٹالا گیا تھا کہ :

شَاعِرٌ نَتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ (طور - ۳۰)

یہ ایک شاعر ہے ہم اس کے لئے حوادث روزگار کی راہ دیکھ رہے ہیں۔

لہٰذا جنہیں اللہ نے عقل دی ہے اور عقل کے ساتھ ایمان کی تھوڑی سی محبت بھی عطا کی ہے تو وہ اس خطرناک اور ایمان سوز ذہنیت کے قریب بھی نہیں جا سکتے۔

۵۔ مہدی موعود کا انتظار

آخری گروہ ان لوگوں کا ہے جو امام مہدی کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ ان کے فکر و استدلال کا نقطہ آغاز یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تیس سال کے بعد خلافت راشدہ کے ختم ہو جانے کی خبر دی تھی چنانچہ وہ اس مدت پر ختم بھی ہو گئی۔ دوسری طرف حضورؐ یہ بھی بشارت سنا گئے ہیں کہ جب دنیا اپنی زندگی کے دن پورے کر چکنے کو ہو گی تو مرد صالح (الامام المہدی) کا ظہور ہو گا۔ جن کے ہاتھوں میں اللہ کی زمین پر خلافت علی منہاج النبوۃ کا قیام عمل میں آئے گا اور اس نقطہ آغاز کا نقطہ انجام یہ ہے کہ اس نصب العین کے برحق ہونے کے باوجود اب ہم اس کے لئے کسی جدوجہد کے مکلف ہی نہیں ہیں۔

استدلال یا فریب استدلال

دین اور اس کے اصول و مقاصد سے بے خبری کا یہ عالم ہے کہ اب اس قسم کی باتوں کو بھی دلیل سمجھا جاتا ہے اور دلیل بھی اتنی زبردست جو مسلمان کی زندگی کا مقصد اور رویہ ہی بدل سکتی ہے اور جس نے افیون کی گولی بن کر کتنے ہی عوام اور خواص کو اپنے فریضہ زندگی کی طرف سے غافل اور بے حس بنا رکھا ہے۔ اس لئے یہ واضح کر دینے کی بہرحال ضرورت ہے کہ یہ دلیل نہیں ہے بلکہ نفس کا یا پھر نگاہ کا ایک

فریب ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے یہ دیکھ لینا چاہئے کہ ظہور مہدی کی خبر ہمیں ملی کہاں سے ہے؟ اور دینی حقائق کی فہرست میں اس کا مقام کیا ہے۔

اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لئے قدرتاً ہماری نگاہ سب سے پہلے قرآن پر جاتی ہے مگر اس کے صفحات کو ہم اس کے ذکر سے بالکل خالی پاتے ہیں حالانکہ دین کی اصولی تعلیمات میں اس مسئلے کو اگر کوئی ایسی اہمیت حاصل ہوتی جو ہماری زندگی کے بنیادی فریضے پر ایک فیصلہ کن انداز میں اثر ڈال سکتی ہو تو عقل عام کہتی ہے کہ قرآن اس کے متعلق ہم کو لازماً واضح ہدایتیں دیتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ تو یہ اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ اس مسئلے کو دین اور دینی افکار و تصورات میں کوئی بنیادی اہمیت حاصل ہی نہیں۔ اور جب صورت واقعہ یہ ہے تو امت مسلمہ کے مقصد وجود جیسے اہم ترین معاملے کے متعلق اسے کوئی فیصلہ کرنے کا حق دینا فکر و نظر کی زبردست کوتاہی ہے۔

اب قرآن کے بعد صحیح احادیث کی طرف رجوع کیجئے تو یہاں بھی اس کی کوئی مضبوط شہادت نہیں ملتی کیونکہ ایک طرف تو ہم دیکھتے ہیں کہ طبقہ اولیٰ کی کتب احادیث میں ظہور مہدی سے متعلق ایک روایت بھی موجود نہیں ہے۔ نہ تو امام بخاری نے ان روایتوں کو قبول کیا ہے، نہ امام مسلم نے، اور نہ امام مالک نے۔ دوسری طرف ان روایتوں میں بھی جنہیں بعد کے ائمہ حدیث نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔ شاید ہی کوئی روایت ایسی ہوگی جو محدثانہ معیار تحقیق پر بالکل بے داغ ثابت ہوتی ہو اور اس کا کوئی نہ کوئی روای شیعہ یا شیعیت سے متاثر نہ نکلتا ہو۔ ان وجوہ سے بعض علماء نے تو ظہور مہدی کی پیش گوئی یا بشارت کو تسلیم کرنے ہی سے انکار کر دیا ہے اگرچہ یہ رائے ایک محتاط رائے نہیں کہی جا سکتی۔ لیکن اس میں کوئی بھی شک نہیں کہ معاملہ، جس اہمیت کا ہے اس کے پیش نظر اس کی روایت زیادہ مضبوط سندوں سے ہونی چاہئے تھی اور اگر ایسا نہیں ہوا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ نہ تو خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے

نزدیک اس معاملہ کی کوئی خاص دینی اہمیت تھی نہ آپ کی ہدایتوں اور آپ کے علوم و ارشادات کو باقی امت تک منتقل کرنے والے صحابہؓ کے نزدیک۔

لیکن ان تمام باتوں سے اگر صرف نظر بھی کر لیا جائے تو سوال یہ ہے کہ اس خبر کا ان ذمے داریوں سے آخر تعلق کیا ہے جو اہل اسلام پر اقامت دین کے ضمن میں عائد ہوتی ہیں؟ اس سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ صرف اتنا ہی تو ہے کہ اس دنیا کا نظام فنا ہونے سے پہلے ایک مبارک دور آئے گا۔ جب سطح زمین کے ایک ایک گوشے سے ظلم اور فساد مٹ جائے گا دنیا عدل سے بھر جائے گی اور حضرت ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ کی طرح "خلافت علیٰ منہاج النبوت" سارے عالم میں قائم ہو جائے گی۔ اس سے یہ کس طرح لازم آگیا کہ بیچ کے زمانوں کے لئے ساری دنیا پر کفر اور طاغوت کی فرمانروائی مقدر ہو چکی ہے اس پیش گوئی میں تو کوئی دور کا بھی اشارہ اس امر کا موجود نہیں ہے کہ ابتدائے اسلام کی تیس سالہ خلافت راشدہ کے اختتام سے لے کر ظہور مہدی تک زمین کے کسی خطے پر بھی اللہ کا دین قائم نہ ہو گا۔ بخلاف اس کے تاریخ گواہ ہے کہ اس دور سعید کے ختم ہونے کے ستر برس بعد ہی حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے ہاتھوں مملکت اسلام میں قریب قریب ویسی ہی بہار سعادت پھر آگئی جو اس دور میں تھی اور اس زمانے کو بھی خلافت راشدہ کا زمانہ تسلیم کیا گیا ہے اس کے علاوہ جس پایہ کی ظہور مہدی والی یہ روایات ہیں۔ قریب قریب اسی پایہ کی کچھ دوسری روایات ایسی بھی ملتی ہیں جن میں مہدی موعود کے علاوہ اور ان سے پہلے اقامت دین کی کچھ اور تحریکوں کے اٹھنے کی پیشگوئیاں کی گئی ہیں اور مسلمانوں پر ان کی حمایت واجب قرار دی گئی ہے مثال کے طور پر دو راویتیں ملاحظہ ہوں:

(۱) اذا رایتم الایات السود قدجاءت من قبل خراسان فاتو ھا ولو حبوا علی الثلج فان فیھا خلیفۃ اللہ مھدی

جب تم دیکھنا کہ خراسان کی طرف سے کالے جھنڈے آ رہے ہیں تو وہاں پہنچنا اگرچہ تمہیں برف کے اوپر گھسٹ کر ہی کیوں نہ جانا پڑے اس لئے کہ ان کے

اندر اللہ کا ہدایت یافتہ خلیفہ ہو گا۔

(۲) يخرج رجل من وراء النهر يقال له الحارث حراث على مقدمته رجل يقال له منصور يواطئى اويمكن لال محمد كما مكنت قريش لرسول الله صلى الله عليه وسلم وجب على كل مسلم نصره اوقال اجابته' (ابو داؤد۔ جلد دوم)

ماوراء النہر سے "حارث حراث) نامی ایک شخص نکلے گا جس کے آگے (یعنی جس کا سپہ سالار) منصور نامی ایک آدمی ہو گا۔ وہ آل محمدؐ کے لئے قوت اور اقتدار پیدا کرے گا۔ جس طرح کہ قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کیا تھا۔ ہر مسلمان پر واجب ہے کہ اس کی مدد کرے یا یوں فرمایا کہ اس کی پکار پر لبیک کہے۔

یہ گمان نہ کرنا چاہئے کہ ان روایتوں میں جن اشخاص کے ظہور کی خبر دی گئی ہے ان سب سے مراد ایک ہی شخص' یعنی وہی "مہدی موعود" ہیں۔ کیونکہ مہدی موعود کا ظہور جیساکہ روایات کا بیان ہے' مدینہ منورہ سے ہو گا نہ کہ ماوراء النہر یا خراسان سے۔ اسی طرح ان کا نام آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر ہو گا (نہ کہ حارث حراث) نیز یہ کہ وہ اہل عرب کے جلو میں نکلیں گے' نہ کہ خراسانی یا تورانی افواج کو لے کر۔ پھر یہ غلط فہمی بھی نہ ہونی چاہئے کہ ان روایات میں حصر ہو گیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں ان تمام داعیان حق کی فہرست گنا دی ہے جو قیامت تک اقامت دین کا علم لے کر اٹھنے والے ہیں۔ اس کے بخلاف ان روایتوں میں صرف بعض افراد اور چند زمانو کا ذکر کیا گیا ہے اور مقصود اس امر کی تاکید ہے کہ جب کبھی بھی ایسے مواقع پیش آئیں تو ہر مسلمان کا فرض ہو گا کہ اقامت حق کی اس مہم سے اپنے کو وابستہ کر دے۔

غرض ان روایات میں نہ صرف یہ کہ مہدی موعود کے ماسوا حق کے کچھ علمبرداروں کی آمد کی بشارت سنائی گئی ہے بلکہ ہر مسلمان پر واجب گردانا گیا ہے کہ سر

کے بل چل کر ان کے پاس پہنچے اور ان کی اعانت و اطاعت میں جان کی بازی لگا دے۔ کیا یہ بات بھی اس بے بنیادی تخیل کا کھوکھلا پن واضح نہیں کرتی کہ اب مہدی موعود کے آنے سے پہلے قیام دین کی جدوجہد سے امت فارغ البال قرار پا چکی ہے؟

پھر اس مسئلہ پر اصولی حیثیت سے بھی غور کیجئے اور دیکھئے کہ ایک بنیادی فریضے کی خود اپنی نوعیت کیا چاہتی ہے؟ جب یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ اقامت دین ہی ہر مسلمان کی زندگی کا تنہا مقصد ہے۔ جب اس فریضے کی خاطر جدوجہد کرنا ہی اس کے ایمان کی کسوٹی ہے جب مومن کا اصل مزاج ہی یہ بتایا گیا ہے کہ باطل اور منکر سے ابدی بیر ہے اور اسے وہ دنیا کے کسی گوشے میں بھی موجود دیکھنا گوارا نہیں کر سکتا۔ اور جب اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اتباع قرآن کے ضمن کا سب سے آخری مطالبہ ہی یہ ہے کہ مسلمان کی سعی و جہد اس وقت تک نہ رکنی چاہئے جب تک کہ دین حق کی کوئی ایک دفعہ بھی معطل ہو' یا زمین کا کوئی ایک ذرہ بھی باطل کے پاؤں تلے دبا پڑا ہو۔ تو ہر مومن کو اپنے طور پر یہ جدوجہد لازماً" کرنی ہی پڑے گی۔ اور ہر حال میں' ہر دور میں' ہر ماحول میں اور ہر جگہ کرنی پڑے گی۔ امام مہدی جب آئیں گے تو وہ فرض اپنا ادا کریں گے نہ کہ میرا اور آپ کا۔ ان کی تمام دوڑ دھوپ صرف اپنے اس بوجھ کو اتارنے کے لئے ہو گی جو اللہ رب العالمین کی طرف سے خود ان پر ڈالا گیا ہو گا۔ کسی دوسرے کا بوجھ وہ اپنے سر نہ لیں گے اور نہ لے سکیں گے۔ اس لئے ان کی سعی و جدوجہد کسی بھی دوسرے مدعی اسلام کے لوائے فرض کی قائم مقام نہ ہو گی۔ جس طرح وہ کسی کی طرف سے نہ تو نماز پڑھیں گے' نہ روزے رکھیں گے۔ اسی طرح وہ کسی کی طرف سے اقامت دین کی جدوجہد بھی نہ کریں گے۔ آپ تو آج ہی سے ان کی جدوجہد پر تکیہ کرکے بیٹھ گئے ہیں جب کہ ان کا وجود عالم تصور اور دنیائے آرزو سے باہر بھی نہیں آیا ہے مگر یقین کیجئے کہ وہ اس وقت کے بھی کسی مسلمان کی طرف سے کوئی دینی فریضہ ادا نہ کریں گے۔ جو ان کے اپنے زمانے میں موجود ہو گا۔ اس وقت بھی ہر مسلمان کو اپنا فرض ٹھیک اسی طرح خود ہی ادا کرنا ہو گا جس طرح کہ امام

موصوف کو اپنا فرض۔ یعنی حضرت مسیح کے لفظوں میں ہر "شخص کو اپنی صلیب خود اٹھانی ہو گی۔" اور جو ایسا نہ کرے گا "آسمانی بادشاہت" میں داخل نہ ہو سکے گا۔ اس حقیقت کے پیش نظر ہر مسلمان کو یہ دعا اور یہ آرزو تو ضرور کرنی چاہئے کہ اس کو کوئی ایسا دور سعادت دیکھنا نصیب ہو۔ جس میں ظلم و فساد کے بوجھ سے کراہتی ہوئی دنیا امن اور انصاف کی رحمتوں سے باغ و بہار بن جائے۔ مگر کسی ایک لمحہ کے لئے بھی خوش فہمی کا یہ فریب نہ کھانا چاہئے کہ کسی نے آنے والے مو کامل کے صدقے میں اب سارے مسلمان بندگی کی بنیادی ذمے داری .... اقامت دین کی جدوجہد .... سے سبکدوش کر دیئے گئے ہیں ورنہ یہ کچھ ویسا ہی ہو گا جیسا کہ عیسائی حضرات نے گمان کر رکھا تھا کہ مسیح نے سولی پر چڑھ کر ہم سے عمل کی ذمے داریاں ساقط کرا دی ہیں۔

احتساب نفس کی ضرورت

اقامت دین کی جدوجہد سے دامن بچانے کے حق میں جو مختلف "فلسفے" پیش کئے جاتے ہیں' اوپر کی مفصل معروضات میں ان کا اور ان کے استدلالی وزن کا حال آپ نے دیکھ لیا۔ اگر ان معروضات پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے اور گروہی' سیاسی اور تقلیدی تعصبات سے بالا تر ہو کر خالص حق پسندانہ نقطہ نظر سے اپنے افکار و اعمال کا جائزہ لیا جائے تو توقع ہے کہ وہ تاریکیاں ضرور چھٹ جائیں گی۔ جو غفلت اور کج فکری کی بدولت نہ جانے کب سے ہمارے ذہنوں پر چھائی چلی آ رہی ہیں۔ اور جنہوں نے ہمارے مقصد وجود کو ہماری نگاہوں سے اوجھل بنا رکھا ہے مگر بھولنا نہ چاہئے کہ نفس اپنا احتساب کرنے میں سخت حیلہ گر اور فریب کار واقع ہوا ہے۔ اس پر کسی غیر مانوس اور نامرغوب حقیقت کا سامنا کرنا بڑا ہی شاق ہوتا ہے اور اس حقیقت کے خلاف تو وہ اپنے ترکش وجل کا آخری تیر تک استعمال کر ڈالتا ہے جو اس سے قربانیوں کی طلب گار ہو۔ صرف جان اور مال ہی کی قربانیوں کی نہیں بلکہ جذبات و میلانات کی

قربانیوں کی بھی۔ پندار علم و فہم کی قربانیوں کی بھی' سابق طرز عمل کی محبت اور عصبیت کی قربانیوں کی بھی کہ بسا اوقات ان چیزوں کی قربانیاں جان و مال کی قربانیوں سے بھی زیادہ دشوار ہوتی ہیں۔ ادھر سے نور حق کی تجلی دکھائی دیتی ہے اور دل پکار اٹھتا ہے کہ سمت قبلہ یہی ہے اور ادھر نفس کے حیلے اور وسوسے اٹھتے ہیں اور انسان سے پوچھتے ہیں. کہ کیا اب تک کی تیری ساری دوڑ دھوپ باطل کی راہ میں تھی؟ کیا زمانے کے شیوخ و اکابر اور وقت کے ارباب علم و دانش جس راستے پر چل رہے ہیں۔ وہ سب کی سب ترکستان ہی کی طرف جاتی ہیں؟" یہ سوالات نفسیاتی حربوں سے ایسے مسلح ہوتے ہیں کہ انسان ان کا شکار ہو جانے سے بہت کم بچتا ہے اور انجام کار ایک چیز کو حق سمجھنے کے باوجود اسے حق تسلیم نہیں کرتا۔ یہ نفس انسانی کی وہی جبلی کمزوری ہے جو ہمیشہ سے اطاعت کے جواب میں بدبخت انسانوں کی زبان سے یہ آواز بلند کراتی رہی ہے کہ:۔

بَلْ نَتَّبِعُ مَا اَلْفَیْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا (بقرہ۔۱۷۰)

بلکہ ہم تو اسی چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔

اس لئے اگر راہ حق و صواب کی سچی طلب ہو تو ضروری ہے کہ نفس کی اس مہلک کمزوری اور دسیسہ کاری سے انسان پوری طرح چوکنا رہے اور اس عظیم اصول کو ہرگز نہ بھولے کہ حق و باطل کا معیار نہ تو کوئی شخص ہے .... بجز ایک شخص کے جس کا نام محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے اور نہ کوئی جماعت ہے .... سوا ایک جماعت کے ' جس کو دنیا اصحاب محمدؐ کے نام سے پکارتی ہے ورنہ وہ اپنے فکر و عمل کا بے لاگ احتساب کر ہی نہیں سکتا اور جب تک یہ توفیق میسر نہ ہو ہدایت یابی کی توقع ہی فضول ہے۔ اس لئے مسئلہ زیر بحث کے سلسلے میں صرف اللہ کی کتاب اس کے رسول کی سنت اور اصحاب رسول کا اسوہ ہی ہمارے سامنے ہونا چاہئے۔ اگر حق اور ہدایت کے ان سرچشموں میں ایک مسلمان کی زندگی کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں بتایا گیا ہے کہ اس کا ہر سانس اقامت دین کے ذکر و فکر اور سعی و جہد میں بسر ہونا

چاہئے تو پھر اس کام کے لئے اپنے کو وقف کر دیجئے' اور ہر اس چیز کو ٹھکرا دیجئے جو اس عزم کی مزاحمت کرے۔ خواہ وہ کسی پیر و مرشد کی ارادت ہو یا کسی شیخ و امام کی عقیدت' کوئی جماعتی رشتہ ہو یا اب تک کا طرز فکر و عمل۔ یہ چیزیں اگر اس صراط مستقیم پر قدم بڑھانے سے روکتی ہیں تو باور کیجئے کہ یہ سب نفس کے حجابات اور شیطان کے فتنے ہیں اور قدرت نے ان کو انسان کے لئے صرف اس مقصد سے پیدا کر رکھا ہے تاکہ اس کی حق پرستی کی آزمائش ہو۔ مبارک ہے وہ بندہ جو ان حجابوں کو چاک کرکے اور ان فتنوں کو کچل کر اپنے فرض کی پکار پر حرکت میں آجائے ورنہ یاد رہے کہ کوئی عقیدت' کوئی ارادت' کوئی رشتہ اور کوئی تاویل بھی ہم کو خدا کی گرفت سے نہیں بچا سکتی۔ جب تک راز حق دل پر نہ کھلا ہو اس وقت تک تو انسان کسی حد تک معذور مانا بھی جا سکتا ہے مگر جب حقیقت بے حجاب نظر آگئی اور دل نے اس کی صداقت کا اعتراف کر لیا تو سمجھ لیجئے کہ اللہ کی حجت تمام ہو گئی اور احتزار کے سارے دروازے بند ہو گئے۔ اب آگے یا تو آمادگی عمل اور کامرانی حیات ہے' یا پھر فرض کا انکار اور نامرادی کا عذاب کیونکہ حق کو حق سمجھ لینے کے بعد اس سے منہ موڑنا اس سنت فرعونی کی پیروی کرنا ہے جس کا تذکرہ قرآن نے ان لفظوں میں کیا ہے۔

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ وَ جَحَدُوْا بِهَا وَ اسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّ عُلُوًّا (نمل۔ ۱۳'۱۴)

جب ان کے سامنے ہماری واضح نشانیاں آئیں تو انہوں نے کہا یہ صاف جادو ہے اور باوجود اس کے کہ ان کے دل ان نشانیوں کی حقانیت پر یقین رکھتے تھے انہوں نے ظلم اور سرکشی کی بنا پر ان کا انکار کر دیا۔

اور اس سنت کی پیروی کا جو انجام ہو سکتا ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ بلاشبہ بڑی کٹھن راہ ہے اور اس کا ہر قدم کانٹوں سے بھرا ہوا ہے مگر رضائے الٰہی کی منزل تک پہنچانے والی اس کے سوا کوئی دوسری راہ نہیں ہے۔ اس لئے اگر اپنی دنیا کو برباد اور آخرت کو تباہ نہ کرنا ہو تو اسے اختیار ہی کرنا پڑے گا۔ لیکن اگر کسی کے تکوے ان

کانٹوں کا خیر مقدم کرنے کی ہمت نہیں رکھتے تو اس کے لئے آخری چارۂ کار جس کو برداشت کیا جا سکتا ہے صرف یہ ہے کہ وہ جہاں ہے وہیں قدم روک کے کھڑا رہے اور اگر کوئی پوچھنے والا اس سے پوچھے تو اسے ضرور بتا دے کہ اگرچہ مجھے اس پر چلنے کی علمی توفیق حاصل نہیں' مگر حق اور نجات کی شاہراہ یہی ہے یہ اس لئے تاکہ کل اللہ تعالیٰ کے حضور ترک فرض کے ساتھ ساتھ کتمان حق کے جرم میں بھی نہ پکڑا جائے اور اگر بدقسمتی سے اس میں اتنی جرات بھی نہ ہو تو پھر اپنے قدموں کی طرح اپنی زبان کو بھی روکے رہے اور کسی حال میں بھی دوسروں کو اس راہ سے روکنے کا وبال اپنی گردن پر نہ لے کیونکہ یہ رویہ کھلا ہوا "صد عن سبیل اللہ" اور صد عن سبیل اللہ ایک ایسی لعنت ہے جس کے تصور ہی سے ایک مسلمان کے رونگٹے کھڑے ہو جانے چاہیں۔

اس موقع پر اس بحث میں جانا فضول ہے کہ آج امت مسلمہ کا کوئی فرد یا گروہ اس بدبختی میں مبتلا ہے یا نہیں؟ کیونکہ یہ صورت حال اگر آج موجود نہیں ہے تو کل موجود ہو سکتی ہے۔ یہ اندیشہ پیش رو امت کے اس عملی ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے قطعاً بے بنیاد نہیں جس کی حکاسی حضرت مسیح علیہ السلام اپنی اس طرح کی تنقیدوں میں فرما گئے ہیں۔

"اے ریا کار فقیہو! اور فریسیو! تم پر افسوس! کہ آسمان کی بادشاہی لوگوں پر بند کرتے ہو کیونکہ نہ تو آپ داخل ہوتے ہو اور نہ داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو۔" (متی باب ۲۳)

ویسے دعا یہی ہے کہ خدا وہ دن کبھی نہ لائے جب کوئی مسلمان حق دشمنی کی اس لعنت میں مبتلا نظر آئے۔

پانچواں باب

اقامت دین کا طریق کار

مقصد سے اصول کار کا فطری ربط

جب یہ بات واضح ہو چکی کہ ہماری زندگی کا عملی نصب العین دین حق کی اقامت ہی ہے اور کوئی تاویل یا عذر اس کی ذمے داری سے ہمیں کبھی سبکدوش نہیں کر سکتا' تو اب پوری سنجیدگی اور اہمیت سے اس بات پر غور کرنا چاہئے کہ اس نصب العین کے لئے جدوجہد کس طرح کی جائے؟ آیا اس کا کوئی مخصوص طریق کار ہے یا جس سمت سے چاہیں اس منزل مقصود کی طرف مارچ کر سکتے ہیں؟ جن لوگوں نے اجتماعیات کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہو گا وہ اس حقیقت سے ناواقف نہیں ہو سکتے کہ ہر جماعت کا جو کسی مقصد کو لے کر اٹھی ہو' جس طرح ایک مخصوص مزاج اور ایک مخصوص انداز فکر ہوتا ہے اسی طرح اس کی تشکیل' تنظیم اور تعمیر کا بھی ایک مخصوص انداز ہوتا ہے اس انداز فکر کی طرح اس انداز تعمیر کا تعین بھی وہی مقصد کرتا ہے جس کو لے کر یہ جماعت اٹھی ہوتی ہے۔

اس اصولی حقیقت کو چند مثالوں سے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔

فرض کیجئے کہ آپ کو ایک قومی حکومت قائم کرنا ہے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے آپ کو جو کچھ کرنا ہو گا وہ یہ ہو گا کہ آپ پہلے تو اپنے افراد قوم کے دلوں کو وطنی سربلندی اور قومی اقتدار کے عشق سے معمور کریں۔ ان میں اپنے اوپر آپ حکمراں ہونے کا عقیدہ اور عزم پیدا کریں' پھر قومی آن پر نثار ہو جانے کے لئے ان کے اندر سرفروشی کی آگ بھڑکائیں اور اپنے محبوب مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ان کی

قوتوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیں۔ جب یہ سب آپ کر لیں تو بس سمجھ لیجئے کہ کامیابی کی تمام شرطیں آپ نے پوری کر لیں۔ اب آپ کو یہ دیکھنے کی قطعاً ضرورت نہیں کہ میرے جھنڈے کے نیچے جو لوگ جمع ہیں وہ توحید کے متعلق، رسالت کے متعلق قیامت کے متعلق اور جزائے عمل کے متعلق کیا خیال رکھتے ہیں؟ ان کے اندر دین کی پابندی کتنی ہے؟ انہوں نے سچائی، رحمدلی، پاک دامنی، خوش خلقی اور خدا ترسی جیسے اوصاف سے اپنے کو کہاں تک آراستہ کر لیا ہے؟ ان میں سے کسی چیز کے بھی دیکھنے کی آپ کو حاجت نہیں، کیونکہ جو مقصد اور نصب العین آپ کے سامنے ہے اس کے سامنے ہے اس کے لئے یہ چیزیں سرے سے مطلوب ہی نہیں ہیں بلکہ شاید کچھ مضر ہی ہوں۔ یہاں تو جو چیزیں مطلوب ہیں وہ صرف یہ ہیں کہ حریف طاقتوں سے اندھی دشمنی اور قوم سے اندھی محبت رکھئے اور اس دشمنی اور محبت میں سب کچھ کر گذریئے۔

اسی طرح اگر آپ ملک میں کیونزم کا اقتدار اور کیونسٹ نظام قائم کرنا چاہتے ہوں تو آپ کو پہلے وہاں کے باشندوں کے ذہن میں کیونسٹ فلسفہ زندگی کیونسٹ نظام معیشت و حکومت اور کیونسٹ نظریہ اخلاق کی "خوبیاں" اتارنی ہوں گی۔ سرمایہ پرستی ہی نہیں بلکہ سرمایہ داری کے بھی خلاف دلوں میں شدید نفرت پیدا کرنی ہو گی۔ مارکس اور لینن کے ساتھ وہ عقیدت پیدا کرنی ہو گی جو خدا اور پیغمبر کے لئے اہل مذہب کے دلوں میں ہوا کرتی ہے۔ اور خدا، رسول، آخرت، دین، اخلاق اور اعمال صالحہ کے الفاظ کو خود غرض سرمایہ پرستوں کے ہتھکنڈے قرار دے کر اور ان کے اثر کو ذہنوں سے مٹا کر خالص مادی تصور حیات اور حیوانی تصور کائنات ان پر ثبت کرنا ہو گا۔ پھر جب آپ یہ بنیاد جما لیں اور ایک بڑی تعداد میں لوگوں کو ان خیالات اور نظریات کا گرویدہ بنا لیں تو ان کا ایک جتھہ بنا کر ایک طرف باقی قوم کو اپنے پروپیگنڈے کے زور سے مسحور کرنے کی جدوجہد جاری رکھیں اور دوسری طرف خفیہ اور علانیہ تمام ممکن ذرائع سے موجودہ نظام حکومت کے تخت کو الٹنے کی مہم شروع کر دیں۔ تا آنکہ عوام کے ہاتھوں

یہ تخت الٹ کر اشتراکی حکومت قائم ہو جائے۔

علیٰ ہذالقیاس اگر ایک شخص منظم طریقے پر رہزنی کرنا چاہتا ہو تو وہ ایسے لوگوں کو تلاش کرے گا جو مضبوط جسم' بے خوف دل اور خونخوار فطرت رکھتے ہوں۔ ایسے آدمی اس کے کسی کام کے نہ ہوں گے جو نرم دل ہوں اور غارت گری و خون ریزی سے متنفر ہوں۔ جب ایسے لوگوں کو وہ حاصل کر لے گا تو ان "ضروری اور کارآمد" صفتوں کا ان میں مزید استحکام پیدا کرنے کی تدبیریں کرے گا۔ لوٹ مار کے انھیں گر سکھائے گا اسلحے مہیا کرے گا تب کہیں جا کر اپنی مہم کا آغاز کر سکے گا۔

غرض دنیا کی ہر بامقصد جماعت کا یہی حال ہے کہ وہ ہمیشہ ایسے ہی لوگوں کو اپنے اندر جگہ دیتی ہے جو اس کے پیش نظر مقصد سے فطری لگاؤ رکھتے ہوں اور لازماً" ایسے ہی طریق کار اور ایسی ہی پالیسیاں اختیار کرتی ہے جو اس مقصد کے مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ ہوں۔ "امت مسلمہ" کہلانے والی جماعت اور قیام دین کا مقصد بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے بھی ایک خاص طریق کار ہونا چاہئے آیئے دیکھیں وہ طریق کار کیا ہے؟

طریق کار کے ماخذ

اس غرض کے لئے ہماری نگاہ اٹھتی ہے تو قدرتاً" وہ قرآن اور سنت ہی پر جا کر ٹھیرتی ہے کیونکہ جہاں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اقامت دین ہمارا فریضہ حیات ہے۔ حق یہ ہے کہ اس فریضے کو ادا کرنے کے اصول کار بھی وہیں سے ملیں۔ کیا قرآن اور سنت نے ہماری اس ضرورت کو محسوس کیا ہے؟ اس سوال کا جواب ہر حیثیت سے مکمل اثبات میں ہے۔ اسلام سے تھوڑی بہت واقفیت رکھنے والا بھی اچھی طرح جانتا ہے کہ قرآن اور صاحب قرآن نے جس طرح امت مسلمہ کا مقصد وجود بالکل وضاحت سے بیان کر دیا ہے اسی طرح اس کے طریق کار کے بارے میں بھی انہوں نے کوئی حجاب باقی نہیں رہنے دیا ہے۔ چنانچہ ہر اس آنکھ کو جو اندھی نہ ہو' قرآن اور سنت

کے صفحوں میں یہ طریق کار اسی طرح نمایاں اور روشن دکھائی دے سکتا ہے جس طرح اندھیری راتوں میں آسمان کے سینے پر جگمگاتی کہکشاں' قرآن' قرآن کے طریق نزول اور صاحب قرآن کے اسوے' تینوں سے طریق کار کی کھلی کھلی نشاندہی ہوتی ہے۔ جو کہنے میں تو تین الگ الگ وجود ہیں مگر زیر بحث مقصد کے اعتبار سے تینوں دراصل ایک ہی ہیں۔ قرآن کے نصوص کو چونکہ اس معاملہ میں بنیاد کی حیثیت حاصل ہے اور باقی دو چیزیں اسی کے توابع اور لوازم کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس لئے اقامت دین کے اصول و طریق کار کی بنیادی وضاحت بھی ہمیں اسی سے لینی چاہئے۔

اقامت دین کے قرآنی اصول

قرآن حکیم کو غور سے پڑھئے تو وہ اصول و نکات بڑی آسانی کے ساتھ ہاتھ آجاتے ہیں جن کے مطابق اقامت دین کی جدوجہد کی جانی چاہئے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ان اصولوں کی تفصیل سے پورا قرآن بھرا ہوا ہے اور یہ ایک ایسی بات ہے جو توقع کے عین مطابق ہے کیونکہ جب اس کے مباحث کا اصل مرکزی ہی یہی اقامت دین ہے تو قدرتی طور پر اس کی ساری تفصیلات بلا واسطہ یا بالواسطہ اسی کے اصول و ذرائع کی شرح و تفصیل ہی ہوں گی۔ لیکن چونکہ قرآن اپنے مدعا کو انسانی ذہن میں پوری طرح بٹھا دینے اور اچھی طرح محفوظ کر دینے کے لئے کوئی ضروری تدابیر اٹھا نہیں رکھتا اور جہاں تک اقامت دین کے مسئلے کا تعلق ہے وہ تو اس کا سب سے اہم بنیادی مسئلہ تھا۔ اس لئے اس کے اصول و طریق کار کو اس نے جہاں سینکڑوں صفحات میں پھیلا کر بیان کیا ہے۔ اور مختلف جگہوں میں اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے وہاں بعض مقامات پر اس نے انھیں اکٹھے سمیٹ کر بھی بیان کیا ہے تاکہ چند جملوں کے مختصر سے آئینے میں ان کی پوری تصویر بیک نظر بھی دیکھی جا سکے۔ اس طرح کے "جوامع الکلم" میں سب سے زیادہ جامع اور ساتھ ہی سب سے زیادہ واضح آیتیں یہ

ہیں :-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُم بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا .... وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ (آل عمران - ۱۰۲ تا ۱۰۵)

اے ایمان والو! اللہ کا ٹھیک ٹھیک تقویٰ اختیار کرو اور دنیا سے نہ رخصت ہو مگر اس حال میں کہ تم "مسلم" ہو اور تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور ٹولی ٹولی نہ ہو جاؤ۔ اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو جو تم پر ہوا ہے جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اس نے تمہارے دل باہم جوڑ دیئے۔ اور اس کے فضل و کرم سے بھائی بھائی ہو گئے .... اور چاہیے کہ تم وہ گروہ بنو جو لوگوں کو بھلائی کی طرف بلائے نیکی کا حکم دے اور بدی سے روکتا رہے' ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں اور (دیکھو) کہیں تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو واضح ہدایتیں پانے کے باوجود ٹولیوں میں بٹ گئے اور اختلاف میں مبتلا ہو گئے۔

یہ آیتیں مدینہ کی زندگی' یعنی ۳ھ میں نازل ہوئی تھیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب امت مسلمہ کی اجتماعی اور سیاسی زندگی تاسیس و تعمیر کے ابتدائی مرحلوں سے گزر رہی تھی۔ عین اس زمانے میں یہ آیت کریمہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اقامت دین اور نظام مومنین کا ایک مختصر مگر جامع ربانی پروگرام لے کر آئیں۔ جس میں اقامت دین کے طریق کار کے نہ صرف عملی اصول ہی بتا دیئے گئے ہیں بلکہ یہ بھی واضح فرما دیا گیا ہے کہ ان اصولوں میں باہم ترتیب کار کیا ہونی چاہیے؟ نیز یہ بات بھی کہ اس کے اس نصب العین کی خاطر کی جانے والی جدوجہد کن تدریجی مرحلوں سے گزرتی ہوئی اپنی

غایت مقصود تک پہنچا کرتی ہے اس ربانی پروگرام پر غور کیجئے تو وہ تین اجزاء یا اصولی نکات پر مشتمل دکھائی دے گا۔

(۱) تقویٰ کا التزام (۲) مضبوط و منظم اجتماعیت (۳) امر بالمعروف و نہی عن المنکر
یہی تین نکات ہیں جو اقامت دین کے بنیادی اصول کار ہیں۔ ان کو تفصیل کی روشنی میں دیکھئے

(۱) تقویٰ کا التزام

اقامت دین کے لئے سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت ہے اور جس کو اس راہ کی "شرط اول قدم" کہنا چاہئے۔ وہ اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ .... کے فرمان خداوندی میں مذکور ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو اپنے کو "ایمان والا" سمجھتا ہو' اور جو اس ایمان کی عائد کی ہوئی ذمے داری سے عہدہ بر آ ہونا چاہتا ہو۔ اس کے لئے لازم ہے کہ اللہ کا "تقویٰ" اختیار کرے اور اپنے آخری سانس تک ہر آن اور ہر لمحہ ایک "مسلم" بن کر زندگی بسر کرے۔ "تقویٰ" کا پورا عملی مفہوم جو قرآن کی زبان سے بیان ہوا ہے اس سے شمہ برابر بھی کم نہیں کہ اللہ کے تمام حکموں کا ٹھیک ٹھیک اتباع کیا جائے۔ اس کے کسی امر کو چھوڑ دینے سے بھی ڈرا جائے اور اس کے کسی نہی کے کرگزرنے سے بھی خوف کھایا جائے۔ اسی طرح "مسلم" کے معنی بھی قرآنی بیانات کی روشنی میں سچے فرماں بردار اور مخلص اطاعت شعار کے ہیں یعنی مسلم وہ شخص ہے جس نے احکام خداوندی کے سامنے اپنی گردن رضاکارانہ جھکا دی ہو۔ اس لئے ان دونوں اصطلاحوں کے مفہوموں کے پیش نظر اقامت دین کے پروگرام کا پہلا جزو' یا اصول یہ ہوا کہ ہر مسلمان سب سے پہلے خود اپنے اوپر اللہ کے دین کو قائم کرے۔ خوف و رجا کی ساری نیازمندیاں بس اسی ایک ذات کے لئے مخصوص کر دے۔ تعظیم و تذلل اور سر افگندگی کے تمام جذبات اسی کی رضاجوئی کے لئے وقف کر دے۔ تمام اطاعتوں سے منہ موڑ کر

بس اسی ایک آقا کی اطاعت کا حلقہ اپنی گردن میں ڈال لے۔ اپنے نفس کو ان تمام امور سے پاک کرے جو اس کی ناخوشی کا سبب بنتے ہیں۔ اور ان تمام صفات سے اسے آراستہ کرے جو اس کی رضا کا باعث ہوتے ہیں۔ اپنے کو اللہ تعالیٰ کا ہمہ وقتی غلام سمجھتا رہے اور اس کے کسی حکم کی بجاآوری میں نہ تولیت و لعل کرے نہ دل تنگ ہو۔ اپنی نگاہ کو حق تعالیٰ کی رضا طلبی اور حکم برداری پر پوری طرح جمائے رہے۔ خواہ کتنی ہی مخالفتیں، مصیبتیں ناسازگاریاں اور دل تنگیاں اس کی راہ میں کیوں نہ حائل ہوں۔ کیونکہ یہ چیزیں اگرچہ بظاہر مشکلات و مصائب ہی ہیں مگر فی الواقع یہ اتباع حق اور التزام تقویٰ کی ضروری آزمائشی منزلیں ہیں جن سے گزرے بغیر کسی مدعی ایمان کا ایمان اور تقویٰ خدا کے ہاں سند اعتبار اور شرف قبول نہیں حاصل ہوتا جیسا کہ قرآن کا فرمانا ہے:۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الخ (بقرہ۔ ۱۵۵)

ہم تم کو (یعنی تمہارے ادعائے ایمان کو) خطروں اور فاقوں اور تمہارے مال اور جان اور پیداوار کے نقصانوں کے ذریعہ ضرور آزمائیں گے اور اے نبی ان لوگوں کو (کامرانی کا) مژدہ سنا دو جو (ان خطرات و نقصانات کو) صبر و ضبط کے ساتھ برداشت کرلیں۔ الخ

أَحَسِبَ النَّاسُ أَن يُتْرَكُوا أَن يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ صَدَقُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَاذِبِينَ (عنکبوت۔ ۱)

کیا لوگوں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہہ دینے پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور انھیں پرکھا نہ جائے گا۔ حالانکہ (یہ پرکھنا ہماری ہمیشہ کی سنت ہے اور) ہم نے ان سے پہلے بھی لوگوں کو پرکھا ہے لہٰذا (تمہیں بھی) اللہ تعالیٰ یہ ضرور دیکھے گا کہ تم میں سے کون سچے (مومن) ہیں اور کون جھوٹے۔

اس لئے ان چیزوں سے گھبرانے اور کترانے کے بجائے ان کا صبر اور اطمینان کے ساتھ مقابلہ کرنا چاہئے ورنہ وہ دل ایمان کا لذت شناس نہیں ہو سکتا جو ان رکاوٹوں کے آگے سپر ڈال دے۔ اور نہ وہ سینہ تقویٰ کے نور سے بہرہ یاب ہو سکتا ہے جو اس آزمائش کی ہمت نہ رکھتا ہو۔ اپنے ایمان و اسلام کے متعلق بڑے دھوکے میں ہو گا۔ وہ شخص جو حدود اللہ کی پاسداری اور احکام قرآنی کی پیروی میں اپنے نام نہاد جانی اور مالی' گروہی اور طبقاتی' قومی اور وطنی مفادات کا بچاؤ پہلے کر لینے کی فکر کرے' اور اتباع حق کو جان و مال کی کامل محفوظیت کے ساتھ مشروط رکھتا ہو۔ ایسے شخص کی زبان پر اسلام' اور اس کی شکل و صورت میں تقویٰ تو ہو سکتا ہے مگر اس کا باطن ان طائران قدس کا آشیانہ نہیں ہو سکتا۔ غرض اہل ایمان کی آزمائش اللہ تعالیٰ کی ایک عام سنت ہے اور اسی سنت کو پورا کرنے کے لئے اس نے اسلام اور اتقاء کا راستہ مشکلات اور مصائب کی چٹانوں سے بھر رکھا ہے اور اس لئے جو شخص اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ .... کے فرمان الٰہی کی تعمیل کرنا چاہتا ہو اس کو ان چٹانوں سے ٹکرانا اور ان کی ٹھوکریں برداشت کرنا ناگزیر ہے۔

(۲) منظم اجتماعیت

اس پروگرام کی دوسری دفعہ یا دوسرا نکتہ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا " وَّ لَا تَفَرَّقُوْا کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ ان لفظوں میں جس چیز کا حکم دیا گیا ہے وہ دو باتوں پر مشتمل ہے ایک تو یہ کہ وہ تمام اہل ایمان' جو احکام الٰہی و حدود خداوندی کی پابندی میں سرگرم عمل اور اپنی انفرادی اصلاح و تزکیہ میں کوشاں ہوں۔ مل کر ایک مضبوط اور منظم جماعت بن جائیں اور یہ پوری جماعت ایک ہی جسم کے اعضاء کی طرح باہم جڑی ہوئی ہو۔ دوسری یہ کہ اسے اس طرح باہم جوڑ کر رکھنے والی چیز نہ تو کوئی نسلی رشتہ ہو نہ کوئی وطنی تعلق' نہ کوئی معاشی یا سیاسی مفاد ہو نہ کوئی دنیوی اور مادی مقصد بلکہ صرف "اللہ کی رسی" یعنی اس کی بندگی کا وہ عہد جو ہر مسلمان نے کر

رکھا ہے۔ وہ قرآن ہو جس کی پیروی کسی شخص کو مومن بناتی ہے وہ دین ہو جس کی اطاعت و اقامت ہی کے لئے امت مسلمہ وجود میں لائی گئی ہے غرض جس طرح ملت کا منظم و متحد رہنا ایک ضروری چیز ہے اسی طرح یہ بات بھی ضروری ہے کہ اس نظم و اتحاد کا شیرازہ صرف یہ "حبل اللہ" ہی ہو۔ بلکہ اگر ذرا گہری نظر سے دیکھا جائے تو بات اس سے بھی کہیں زیادہ اہم نظر آئے گی۔ اتنی زیادہ اہم کہ مجبوری کی بعض ایسی حالتیں تو ہو سکتی ہیں جن میں اتحاد و تنظیم و ملت سے محروم ہو کر بھی مومن خدا کے حضور معذوری اور بری قرار دیا جائے گا مگر جو چیز اس اتحاد و تنظیم کا شیرازہ ہے اسے کسی حالت میں بھی اگر چھوڑ دیا گیا تو اس کی باز پرس سے چھٹکارا ہرگز نہ ہو سکے گا۔ اس لئے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہئے کہ اسلام کے نزدیک نفس اتحاد ہی کوئی مطلوب و محبوب چیز ہے خواہ وہ کسی غرض کے لئے اور کسی مقصد پر مبنی کیوں نہ ہو۔ اس کے بخلاف حقیقت یہ ہے کہ اگر اتحاد کی بنیاد کسی فاسد مقصد پر رکھی گئی ہو تو نہ صرف یہ کہ وہ اسلام کا مطلوب نہیں' بلکہ اس کی نظروں میں حد درجہ مردود اور مبغوض ہے اور اس اتحاد سے بال برابر بھی مختلف نہیں جو چوروں اور ڈاکوؤں کے مابین ہوا کرتا ہے۔ اسلام کا مطالبہ اس اتحاد کا ہے جس کا شیرازہ اتباع حق اور اقامت حق ہو۔

اقامت دین کا نکتہ' یعنی جماعتی اتحاد' اگر ذرا غور کیجئے تو پہلے نکتہ سے کوئی بالکل الگ اور بے تعلق شے نہیں ہے بلکہ اسی کا ایک فطری تقاضا ہے۔ ایک طالب علم کو اس کی اپنی طبیعت ہی مجبور کرتی ہے کہ اپنے ساتھی طلباء سے بے تکلفی' دل بستگی اور الفت و محبت رکھے۔ ایک تعلیم یافتہ اور علم دوست کے مذاق اور مزاج ہی کا یہ مطالبہ ہوتا ہے کہ ارباب دانش کی ہم نشینی اختیار کرے۔ ایک رنگین طبع اپنے جیسے رنگین مزاجوں کی طرف خودبخود کھنچ اٹھنے سے رک نہیں سکتا .... اور اگر کسی طالب علم کو اپنے ساتھیوں سے' کسی صاحب علم کو اہل علم و فضل سے' کسی رنگین مزاج کو اہل نشاط سے گہری وابستگی نہ ہو تو یقین کرنا چاہئے کہ وہ صحیح معنوں میں طالب اور صاحب علم اور رنگین طبع نہیں۔ ہم مشربی کی یہی وہ کشش ہے جس کو عام اصطلاح

میں جاذبہ جنسیت کہا جاتا ہے۔ اصولاً اس جاذبہ جنسیت کو اہل تقویٰ کے درمیان بھی اپنا کام کرنا چاہئے اور وہ کرتا بھی ہے۔ ایک وہ انسان جو خدا پرستی کے جذبات سے سرشار ہو ان لوگوں کی طرف لازماً کھنچتا ہے جو اسی کی طرح اتباع حق اور تقویٰ کے لذت شناس ہوں۔ یہ ممکن نہیں کہ دو دلوں میں خدا کا حقیقی تقویٰ موجود ہو اور اس کے باوجود وہ آپس میں کٹے ہوئے یا ایک دوسرے سے بے تعلق ہوں۔ اس کے بخلاف ان میں جذب و انجذاب لازمی ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو سمجھنا چاہئے کہ تقویٰ کی صورت میں اندر کوئی دوسری ہی روح پرورش پا رہی ہے کیونکہ ایک ہی منزل اور ایک ہی راہ کے دو مسافر ایک دوسرے کے غیر بن کر نہیں رہ سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ جو آپ دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کی تعریف اگر کہیں اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ اور بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ کے الفاظ سے کی گئی ہے تو کہیں رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ اور اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ان کا نشان امتیاز ٹھیرایا گیا ہے گویا اسلام کے پیروؤں کا باہم جڑ کر رہنا ان کے ایمان اور اتقا کی کسوٹی ہے۔ قرآن کی نگاہ میں اہل ایمان کے لئے اس وصف کا وجود کتنی اہمیت رکھتا ہے اس چیز کا اندازہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی بعض ہدایات پر بھی نظر ڈالی جائے جو اس معاملے کے منفی پہلو سے تعلق رکھتی ہے ان میں سے ایک ہدایت یہ ہے:۔

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا اٰبَاءَكُمْ وَ اِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَاءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ وَ مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (توبہ۔ ۲۳)

اے ایمان لانے والو! اگر تمہارے باپ اور بھائی ایمان کے مقابلے میں کفر کو ترجیح دیں تو ان کو اپنا ولی (قلبی رفیق) نہ بناؤ۔ اور جو لوگ ان کو اپنا ولی بنائیں گے تو وہی ظالم ہوں گے۔

معلوم ہوا کہ جس طرح ایک سچا مومن اور متقی دوسرے مومنوں سے بے تعلق نہیں رہ سکتا خواہ نسلی اور قومی لحاظ سے وہ اس کے بیگانے ہی کیوں نہ ہوں اسی

طرح وہ فساق و فجار سے قلبی رابطہ بھی نہیں رکھ سکتا خواہ وہ اس کے قریب ترین عزیز ہی کیوں نہ ہوں۔ قرآن اس کے امکان کو بھی تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہے کہ جیسا کہ اس ضمن کی ایک اور آیت صراحت کرتی ہے۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّونَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ

(مجادلہ - ۲۲)

تم کسی ایسے گروہ کو جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو ان لوگوں سے الفت و مودت کا رشتہ رکھتا ہوا نہ پاؤ گے جو اللہ اور اس کے رسول کی عداوت اور مخالفت پر کمربستہ ہوں خواہ وہ اس کے اپنے ہی باپ یا بیٹے یا بھائی یا اہل خاندان کیوں نہ ہوں۔

ان ارشادات سے یہ حقیقت پوری طرح روشن ہو جاتی ہے کہ ایمان کے رشتے کو انسانی تعلقات میں فیصلہ کن حیثیت حاصل ہے وہ ایک طرف تو مختلف نسلوں اور قوموں کے افراد کو باہم بھائی بھائی بنا کر جوڑ دیتا ہے۔ دوسری طرف اس کی زبردست قوت تمام مادی رشتوں کو بے جان اور غیر موثر بنا کر رکھ دیتی ہے۔ گویا یہ ایک سورج ہے جس کے آگے تمام ستارے بے نور ہو کر رہ جاتے ہیں۔ پھر ایمان کا یہ منفی اثر و عمل اس کے مثبت اثر و عمل کو مزید طاقت بھی دے دیتا ہے اور اہل ایمان کے مابین قائم ہونے والے اتحاد کو زیادہ مستحکم بنا دیتا ہے۔

غرض ایک نصب العین کی علم بردار اور ایک اصول کی پیرو دوسری جماعتیں جس حد تک اپنے ارکان کو ڈسپلن کی مضبوط بندشوں میں باندھ کر رکھتی ہیں اللہ کا دین اپنے پیرووں کو اس سے بھی زیادہ مضبوطی سے جڑ جانے کی زبردست ہدایت کرتا ہے۔ انتشار و اختلاف کو وہ انتہائی مذموم ٹھیراتا ہے اور دین حق کے مزاج کے اسے یکسر خلاف قرار دیتا ہے۔ حد یہ ہے کہ ایک پیغمبر (حضرت ہارون علیہ السلام) نے اپنی قوم کی اکثریت کو علانیہ بت پرستی میں مبتلا ہو جاتے دیکھا مگر انہیں صرف سمجھانے بجھانے

پر ہی اکتفا کیا اور ان کے خلاف کوئی فوری اقدام اٹھانے سے محض اس لئے احتراز کر گئے کہ کہیں قوم کی جمعیت پراگندہ نہ ہو جائے اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سینا کی پہاڑی سے واپس آکر ان سے اس سلسلے میں سختی سے باز پرس کی تو انہوں نے عذر پیش کرتے ہوئے کہا کہ خَشِيتُ أَن تَقُولَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِي إِسْرَائِيلَ (میں اس بات سے ڈرا کہ آپ کہیں گے تم نے بنی اسرائیل میں پھوٹ ڈال دی)

(۳) امر بالمعروف و نہی عن المنکر

اقامت دین کے پروگرام کی تیسری بنیاد وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ کے ارشاد میں واضح کی گئی ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ انفرادی حیثیت سے اپنی اپنی ذات کے اوپر دین حق کو قائم کرلینا اور پھر ایسے تمام افراد کا باہم جڑ کر ایک جماعت بن جانا ہی کافی نہیں ہے بلکہ ان دونوں باتوں کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس "خیر اور معروف" کی طرف دوسروں کو بھی بلایا جائے جس کو خود قبول کیا گیا ہے اور اس "منکر" کو اپنے مقدور بھر مٹا ڈالنے کی مسلسل کوشش جاری رکھی جائے جس کو خود ترک کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ خدا کی زمین کے کسی گوشہ میں اس کے دین کے سوا کسی اور دین کا اقتدار باقی نہ رہ جائے۔

جس طرح اقامت دین کے عملی پروگرام کی دوسری دفعہ (افراد امت کا منظم اتحاد پہلی دفعہ انفرادی صلاح و تقویٰ) کا لازمی تقاضا ہے اس طرح یہ تیسری دفعہ (امر بالمعروف و نہی عن المنکر) بھی اس کا فطری مقتضا ہے نہ کہ کوئی ایسا مستقل بالذات حکم جو اس کے کسی طرح کی مزاجی مناسبت رکھتا ہی نہ ہو' یہ بات کہ امر بالمعروف کس طرح ایمان اور تقویٰ کی فطری طلب ہے ایمان اور تقویٰ کی حقیقتوں پر غور کرنے سے با آسانی واضح ہو جاتی ہے۔ ایمان اور تقویٰ کی حقیقی روح کیا ہے؟ صرف اللہ تعالیٰ کی محبت بھری تعظیم۔کوئی محبت بھری تعظیم محبوب کی مرضیات کے بارے میں کیا چاہے گی؟

صرف یہ کہ گردوپیش انہی کی کار فرمائی ہو۔ ورنہ اس دل کو سوز محبت سے آشنا کون کہہ سکتا ہے جو محبوب کی مرضی کو پامال ہوتا ہوا دیکھ کر تڑپ نہ اٹھے؟ اس لئے خدا کی محبت اور حق کی جذبیت ایک خدا پرست کو چین سے ہرگز بیٹھنے نہیں دے سکتی۔ جب تک کہ صفحہ ارض پر اس کی نگاہوں میں چبھنے کے لئے ایک باطل اور کھٹکنے کے لئے ایک منکر بھی موجود ہو۔ یہ بات اس کے اسلام اور ایمان کے یکسر منافی ہے کہ کسی شخص یا گروہ یا ملک کو وہ دین اللہ کے حلقہ انقیاد سے آزاد اور طاغوت کا فرمانبردار دیکھے۔ اور ٹھنڈے دل سے اسے برداشت کرلے۔ لہٰذا اقامت دین کا فریضہ ادا نہیں ہو سکتا' اگر پیروان اسلام کی جمعیت امر بالمعروف سے غافل ہو اور اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ کا حکم تشنہ تعمیل ہی رہ جائے گا اگر اہل ایمان بس اپنی ذات ہی تک احکام الٰہی کی پیروی کو کافی سمجھ لیں اور ان کو اس سے کوئی غرض نہ ہو کہ باقی دنیا کدھر جا رہی ہے۔

اس کے علاوہ امر بالمعروف مومن اور مسلم اور متقی ہونے کے فطری تقاضوں میں ایک اور پہلو سے بھی داخل ہے اور وہ ہے اللہ کے بندوں سے اخوت' محبت اور خیرخواہی کا پہلو۔ جو شخص اسلام کو جانتا ہے وہ یہ بات بھی جانتا ہو گا کہ خدا سے محبت کرنے کا حق اس وقت تک ہرگز ادا نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی مخلوق سے بھی محبت نہ رکھی جائے اس مخلوق سے جسے اس کے رسول نے اس کی "عیال" کہا ہے (الخلق عیال اللّٰه) اور جس کی بہی خواہی کو ایمان کی نشانی ٹھیرایا ہے (لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يُحِبَّ لِاَخِيْهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهٖ) (مسلم) نوع انسانی کے ساتھ بہی خواہی کی شکلیں بہت سی ہیں۔ مگر اس سے بڑی اس کی اور کوئی بھی خواہی نہیں کہ اسے ان راستوں سے بچایا جائے جو گمراہی اور ابدی ہلاکت کے راستے ہیں۔ اور جن پر چل کر انسان کی دنیا بھی عذاب بن جاتی ہے اور آخرت بھی۔ اس لئے ایک مومن اگر اپنے دوسرے ابنائے جنس کو "منکرات" سے روکنے اور خیر و معروف کی طرف لانے کی کوشش کرتا ہے تو یہ دراصل کسی خارجی سبب کے تحت نہیں کرتا۔ بلکہ اپنے اس

جذبہ خیر خواہی کے تحت کرتا ہے جو اس کے ایمان کا پیدا کیا ہوا ہوتا ہے۔ جس طرح اس کا ایمان اسے اس بات پر ابھارتا رہتا ہے کہ بھوکوں کو کھانا کھلائے، ننگوں کو کپڑے پہنائے، اور کمزوروں اور بے کسوں کی مدد کرے" اسی طرح "مگر اس سے کہیں زیادہ شدت کے ساتھ وہ اسے اس بات کے لئے بے چین رکھتا ہے کہ حق سے محروم بندگان خدا کو اس خزانہ سعادت کی کنجیاں مہیا کر دے جس کے پالینے کے بعد وہ نہ کبھی بھوکے ہوں گے نہ ننگے (اَنْ لَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى) نہ انہیں اپنے مستقبل کا کوئی اندیشہ لاحق ہو گا نہ اپنے ماضی اور حال کا کوئی غم (لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ) اس کی ایمانی فکر و نظر اسے بتاتی رہتی ہے کہ دوسرے انسانوں کے ساتھ اگر یہ بنیادی اور مقدم ترین خیر خواہی نہ کی گئی تو باقی ساری ہمدردیاں اور خیرخواہیاں بالکل ہیچ ہیں اور ان سے خدا کے بندوں کے حقوق ہرگز ادا نہ ہوں گے اور خدا کے بندوں کے حقوق کا ادا نہ ہونا خود اس کے حقوق سے عہدہ برآ نہ ہونے کی دلیل ہے۔

ایمان" اسلام اور تقویٰ سے امر بالمعروف کے یہ وہ داخلی اور فطری تعلق تھے۔ ان کے علاوہ ان سے اس کا ایک خارجی تعلق اور منطقی تعلق بھی ہے۔ جسے ہم دعوت اسلامی کا سیاسی مفاد کہہ سکتے ہیں۔ یعنی امر بالمعروف اسلام و ایمان کا فطری مطالبہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی ایک سیاسی ضرورت بھی ہے اور وہ یہ کہ دعوت اسلامی کا علمبردار گروہ امر بالمعروف کا فریضہ بجالا کر ہی اپنے ایمانی جوہر کو پوری طرح برقرار رکھ سکتا ہے۔ اور اپنے مقصد کے حصول میں پوری طرح کامیاب ہو سکتا ہے اس کے مختلف وجوہ ہیں :۔

(ا) اقامت دین کی عملی جدوجہد لازماً" حق و باطل کی ایک طویل اور شدید جنگ کا دوسرا نام ہے۔ مقابلوں اور لڑائیوں کے متعلق فطرت کا یہ ایک اٹل قانون ہے کہ وہی فریق کامیاب ہوتا ہے جو اقدام کی عملی جرات رکھتا ہو' بقا اور ارتقا صرف پیش قدمی میں ہے۔ زبردست سے زبردست فوج بھی اپنے آپ کو شکست کی ذلت سے

نہیں بچا سکتی اگر وہ دشمن سے مقابلے کے وقت اس پر آگے بڑھ کر حملے کرنا نہ جانتی ہو۔ اسی طرح کوئی تحریک بھی زوال و انحطاط کا شکار ہونے سے نہیں بچ سکتی۔ اگر وہ صرف اپنی داخلی تعمیر و تنظیم میں مصروف رہے اور اپنے بیرونی ماحول کی تسخیر کی مہم سے غافل ہو۔ اس لئے وہ جماعت جو اللہ کا دین قائم کرنے کے لئے کوشاں ہو اس وقت تک کامیابی کی مستحق نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ ــــــــــ طاغوتی مورچوں پر مسلسل حملے نہ کرتی رہے۔ وہ اسلحہ جس سے یہ حملے کئے جا سکتے ہیں صرف امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا اسلحہ ہے۔

(۲) جس طرح ایک جاندار کا جسم مختلف وجوہ سے کچھ نہ کچھ برابر تحلیل ہوتا رہتا ہے اور اسے اپنی اصل طاقت عزیزی کو بحال رکھنے کے لئے غذاؤں کی ضرورت پڑتی رہتی ہے تاکہ وہ اس کی رگوں میں تازہ خون پہنچا کر اس کی زائل شدہ قوت کو واپس لاتی رہیں۔ اسی طرح اقامت دین کی جدوجہد میں مصروف گروہ کو بھی ایسے مختلف اسباب اور حالات سے سابقہ پیش آتا رہتا ہے جو اس کی توانائی کو متاثر کر دیا کرتے ہیں اس لئے اسے بھی اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس کے ایمان کو قوت بخش غذائیں دی جائیں' جو اس کے اندر خدا پرستی کی توانائیاں تازہ تازہ داخل کرتی رہیں تاکہ وہ برابر چست رہے' فعال رہے اور ترقی کرتا رہے ورنہ رفتہ رفتہ اس کی قوت مرجھاتی چلی جائے گی۔ اور خود اس کے اپنے اوپر سے بھی دین کا اقتدار ڈھیلا ہوتا چلا جائے گا۔ ان "قوت بخش غذاؤں" میں سے جن سے یہ ایمانی توانائیاں حاصل ہوتی ہیں۔ "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" بھی ایک بہترین "غذا" ہے۔

(۳) یہ کائنات اور اس کی ہر شے طبعاً متحرک پیدا کی گئی ہیں ٹھہراؤ سے اس کی فطرت نا آشنا ہے اس لئے وہ کسی ایک حالت پر رکی نہیں رہ سکتی۔ بلکہ بڑھتی ہے کہ کسی نہ کسی سمت حرکت کرتی رہے۔ اسے اگر آگے بڑھنے کا موقع نہ ملے تو خود بخود ہی ہٹنے لگے گی۔ یہی "قانون حرکت" قیام دین کے بارے میں بھی کام کرتا ہے۔ اس کو ایک مذکورہ اور فاتح تحریک کی شکل میں برابر آگے بڑھتے رہنا چاہئے۔ ورنہ جہاں

اس میں رکاوٹ پیدا ہوا اور اس کی اقدامی حرکت' جمود سے بدلی۔ وہ پیچھے ہٹنا شروع کر دے گا۔ اس اقدامی حرکت کی ایک ہی عملی شکل ہے جس کا نام امربالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔

یہ ہیں وہ مختلف داخلی اور خارجی پہلو جن کی بنا پر امربالمعروف' ایمان اوز اسلام اور تقویٰ ہی کا ایک قدرتی مطالبہ ہے۔

نبوی طریق کار کی شہادت

اقامت دین کا یہ طریقہ اور اس کے یہ اصول تو ہمیں قرآن سے ملتے ہیں۔ اب اگر آپ قرآن کے معلم صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیار کئے ہوئے طریق کار پر نظر ڈالیں تو پائیں گے کہ وہی اصول جو قرآن کے اندر الفاظ کے لباس میں تھے یہاں عمل اور واقعہ کی شکل میں موجود ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ٹھیک انہی لائنوں پر ایک امت بنا کر اللہ کے دین کو قائم کیا تھا۔

آپ نے عرب کے اندر' جس کا چپہ چپہ دین طاغوت کی آہنی گرفت میں جکڑا ہوا تھا اپنی سعی و جدوجہد کی ابتدا ایک کلمے سے کی۔ جس کا عملی مفہوم یہ تھا کہ انسان اپنے تمام افکار و خیالات' جذبات و میلانات' اور اپنی زندگی کے تمام مسائل و معاملات کو اس اللہ کے تابع فرمان بنا دے جس کے سوا اس زمین پر کسی کو اپنی مرضی منوانے اور اپنا حکم چلانے کے استحقاق نہیں۔ یہ نامانوس آواز جن بہرے کانوں سنی گئی اور اس کو دبانے کے لئے جن انسانیت سوز مظالم سے کام لیا گیا ان سے کوئی صاحب نظر ناواقف نہیں ہے۔ سیاسی حالات نے آنکھیں دکھائیں' وطنی مفاد نے آڑے آنے کی کوشش کی۔ وقت اور ماحول نے ساتھ دینے سے انکار کیا۔ مصلحتوں نے دامن پکڑا' مشکلات نے راستہ روکا۔ ہلاکتوں کا طوفان نمودار ہوا۔ مگر اللہ کے اس بندے نے اپنی آواز میں کبھی کوئی پستی نہیں آنے دی۔ اور حالات زمانہ' رفتار واقعات اور مستقبل کے امکانی خدشات' غرض ہر چیز سے آنکھیں بند کر کے برابر اسی حقیقت کو دوسروں پر

کھوتا رہا' جو خود اس پر عمل چکی تھی اور باوجود اس کے کہ وہ اپنے عقیدۂ توحید اور تصور زندگی میں بالکل اکیلا تھا لیکن اس نے ایک لمحہ کے لئے بھی یہ گوارا نہ کیا کہ اس عقیدے اور تصور کو چھپائے رکھے حالانکہ پوری دنیا اس کی زبان بندی پر کمربستہ تھی۔ بالآخر اس دعوت حق نے دلوں کو مسخر کرنا شروع کیا اور جن لوگوں کے اندر قبول حق کی صلاحیتیں ابھی زندہ تھیں وہ ایک ایک دو دو کرکے آپ کے حلقہ اطاعت میں آنے لگے۔ آپ نے ان کے اندر سب سے پہلے خدائے واحد کی غلامی اور پرستش کا گہرا نقش بٹھایا اور اصولی طور پر ان کو یہ بات سمجھا دی کہ رضا صرف اسی کی چاہو۔ کیونکہ وہی ہے جس نے تمہیں زندگی بھی عطا کی ہے اور زندگی کو بسر کرنے کا سامان بھی دیا ہے اور حکم صرف اسی کا مانو' کیونکہ اس کے سوا سب تمہاری ہی طرح عاجز اور غلام ہیں۔ اسی طرح اپنی مسلسل تعلیم و تربیت سے آپ نے ان کے دلوں کو ایک خدا کی بندگی کا ایسا گرویدہ بنا دیا کہ دین توحید کے دشمنوں نے اپنے ترکش ظلم و انتقام کے سارے تیر خالی کر دیئے مگر کسی بندہ مومن کا دل توحید کی محبت سے خالی نہ کر سکے۔

اس تعلیم و تربیت اور تزکیہ کے ساتھ ساتھ ان سب لوگوں کو جو حلقہ اسلام میں داخل ہوتے جا رہے تھے۔ آپ ایک خاندان کے افراد کی طرح باہم جوڑتے گئے۔ یہ جڑنا اخلاقی طور سے اتنا پائیدار تھا کہ بھائی بھائی کے رشتے اس کے سامنے ماند پڑ گئے اور آگے چل کر اجتماعی و سیاسی نقطہ نگاہ سے بھی اتنا منضبط نکلا کہ آج تک دنیا کی کوئی تنظیم اس کی یکتائی کو چیلنج نہ کر سکی۔ اس سلسلے میں آپ نے اہل ایمان کو جو غیر معمولی ہدایتیں دیں وہ کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اور پھر جس طرح ان ہدایتوں پر انہوں نے عمل کیا وہ بھی دنیا پر روشن ہے۔ زندگی کے پیش آمدہ مسائل اور معاملات میں جس موقع پر بھی منظم اجتماعیت کا کوئی رنگ پیدا کرنے کی گنجائش نظر آئی' آپ نے اس کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ خواہ معاملہ کتنی ہی معمولی قسم کا کیوں نہ ہوتا۔ حد یہ ہے کہ اگر تین آدمی ایک ساتھ کسی سفر پر بھی جاتے تو آپ کی ہدایت ہوتی کہ وہ اپنے میں سے ایک کو امیر بنا لیں اور اس کی سرکردگی میں سفر کریں۔ (اِذَا کَانَ ثَلَاثَۃً

فِیْ سَفَرٍ فَلْیُؤَمِّرُوْا اَحَدَھُمْ۔ مشکوۃ) مسلمانوں کے ذہن میں اس طرح اجتماعیت کی اہمیت پیوست کرتے اور انہیں ایک جسم کے اعضاء کی طرح باہم جوڑتے ہوئے آپ نے اس امر کا بھی پورا اہتمام فرمایا کہ افتراق و انتشار کے عوامل اس اتحاد میں رخنے نہ پیدا کرنے پائیں۔ اس غرض سے آپ نے انہیں پوری طرح متنبہ کر دیا کہ امت کا یہ اتحاد و اختلاف عام قسم کی صرف ایک "سیاسی" ضرورت نہیں ہے بلکہ یہ ایک خالص دینی ضرورت ہے اور اس کے بغیر وہ کام کسی طرح پورا ہی نہیں ہو سکتا جس کے لئے میری بحیثیت ایک نبی کے، اور تمہاری بحیثیت ایک امت کے بعثت ہوئی ہے۔ اللہ کی نصرت بھی تمہارے سروں پر اپنا سایہ اسی وقت ڈالے گی۔ جب تم جماعت (ایک منظم پارٹی) کی شکل میں رہو (یَدُ اللّٰہِ عَلَی الْجَمَاعَۃِ) اگر کوئی شخص اس جماعتی نظام سے بالشت بھر بھی الگ ہو گیا تو گویا اس نے اپنی گردن سے اسلام کا قلاوہ نکال پھینکا۔ (مَنْ خَرَجَ مِنَ الْجَمَاعَۃِ قِیْدَ شِبْرٍ فَقَدْ خَلَعَ رِبْقَۃَ الْاِسْلَامِ مِنْ عُنُقِہٖ اِلَّا اَنْ یُّرَاجِعَ۔ ترمذی) اور اسی علیحدگی کی حالت میں اگر وہ مر گیا تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہو گی۔ (مَنْ مَاتَ وَھُوَ مُفَارِقٌ لِلْجَمَاعَۃِ مَاتَ مِیْتَۃً جَاھِلِیَّۃً۔ مسلم) ملت کے مقدس شیرازے پر جو شخص بھی افتراق کی قینچی چلانے کی کوشش کرے اس کی گردن مار دینا۔ (مَنْ اَرَادَ اَنْ یُّفَرِّقَ اَمْرَ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ وَھِیَ جَمِیْعٌ فَاضْرِبُوْہُ بِالسَّیْفِ کَائِنًا مَّنْ کَانَ۔ مسلم)

ان دونوں باتوں کے ساتھ ساتھ آپؐ اور آپؐ کے ساتھی اہل ایمان اللہ کے دین کو اس کے دوسرے بندوں تک پہنچانے میں برابر مصروف رہتے اور جس کسی کو جاہلیت کی نجاستوں میں آلودہ پاتے اسے ان سے پاک کر کے ایک خدا کا پرستار، ایک آقائے حقیقی کا غلام، اور ایک حاکم مطلق کا محکوم بنانے کی کوشش کرتے رہتے۔ جس بدی کو دیکھتے اس کو مٹانے کے در پے ہو جاتے۔ اور کفر و فساد کے جس طوفان سے رحمت حق نے انہیں نجات دی تھی اس میں دوسروں کو ڈوبتے دیکھنا انہیں کسی حال

میں بھی گوارا نہ ہوتی۔ یہ دعوتی جدوجہد مکہ میں تیرہ برس تک چل پائی تھی کہ دشمنان حق کے لئے اس کی کامیابی اور روز افزوں ترقی ناقابل برداشت ہو گئی اور انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی سازش کرکے اس دعوت کو فنا کر دینا چاہا۔ اس لئے آپؐ نے اور آپ کے پیروؤں نے اپنے عزیز وطن کو خیرباد کہہ دیا اور مدینہ جا کر اسے اپنے مشن کا مرکز بنایا۔ جب کفار نے وہاں بھی چین نہ لینے دیا اور ادھر اہل ایمان کی ایک منظم جمعیت بھی فراہم ہو چکی تھی تو اب بدی کی جڑیں کاٹ کر رکھ دینے اور نیکی اور انصاف کی بقا کے لئے آخری شکل اختیار کی گئی۔ یعنی منکر کو مٹا دینے کے لئے دل و زبان کی کوششوں کے علاوہ اب ہاتھ کی بھی کوششیں شروع کر دی گئیں۔ ایک مدت تک طاغوتی طاقتیں خود بخود بڑھ بڑھ کر مدینہ پر حملہ آور ہوتی رہیں۔ اور آپؐ اور آپ کے ساتھی صرف مدافعت کرتے رہے اس مدافعت میں انہوں نے جان و مال کی ہر ممکن قربانی دے کر حق کی شہادت ادا کی۔ یہاں تک کہ اس مدافعانہ پالیسی ہی کے دوران کفر کی شوکت ٹوٹنے لگی۔ اور آخر کار عرب میں طاغوت کا علم سرنگوں ہو گیا۔ اسے دیکھ کر مسلمانوں کا دل اللہ کی تائید و نصرت پر شکر اور مسرت کے جذبات سے بھر گیا مگر اس کے باوجود ان کے لئے اپنی کمریں کھول لینے کا ابھی کوئی موقعہ نہ تھا۔ اس لئے ان کی سواریوں کے کجاوے اسی طرح بندھے کے بندھے رہے کیونکہ اگرچہ عرب میں بدی نے ہتھیار ڈال دیئے مگر اس کے باہر ہر طرف اس کی حکمرانی پوری شان کے ساتھ قائم تھی اور مسلمان اپنے فرض کو بھول نہیں سکتا تھا کہ منکر کو مٹا دینا چاہئے خواہ وہ کہیں بھی ہو۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

ان تفصیلات سے یہ حقیقت اچھی طرح روشن ہو جاتی ہے کہ قرآن مجید ہو یا سنت رسولؐ ہر ایک سے اقامت دین کے یہی تین بنیادی اصول معلوم اور متعین ہوتے ہیں۔ اس لئے اس فرض کو ادا نہیں کیا جا سکتا' جب تک کہ ان تینوں اصولوں پر

پورے عزم و استقلال کے ساتھ عمل نہ کیا جائے لیکن اس سلسلے میں یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہئے کہ اس عمل درآمد میں کوئی ایسی زمانی ترتیب ہے جس کی رو سے ضروری ہے کہ جب پہلے اصول پر پوری طرح عمل ہو لے تب دوسرے کی ابتداء کی جائے اور جب دوسرے اصول کی پیروی کا حق ادا ہو جائے تب کہیں جا کر تیسرے کا نام لیا جائے۔ اس کے برعکس صحیح بات یہ ہے کہ ان تینوں اصولوں پر عمل بیک وقت شروع ہو جانا چاہئے اور اگر اس عظیم مہم کے شروع کرنے سے پہلے کسی بات کی ضرورت ہے تو صرف اس بات کی ہے کہ ذہن کی پوری یکسوئی اور دل کی سچی شہادت کے ساتھ انسان کا لا الہ الا اللہ اور محمد الرسول اللہ پر ایمان ہو۔ اس یقین و اقرار کے بعد جب ایک شخص یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے مخاطب کئے جانے والے گروہ میں داخل ہو گیا۔ تو قرآن ایک ہی ساتھ اس کے سامنے اپنے یہ تینوں اصول رکھ دیتا ہے اور اس کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ اپنے حالات اور اپنی استطاعت کے مطابق ان پر عمل کرے۔

اس بات کی سب سے بڑی دلیل، کہ ان اصولوں پر عمل ایک ساتھ ہونا چاہئے یہ ہے کہ ان میں عملی پیروی کے لحاظ سے تفریق کرنا سرے سے ممکن ہی نہیں کیونکہ دوسرے اور تیسرے اصول اپنی حقیقت کے اعتبار سے اپنی ایسی کوئی مستقل بالذات نوعیت رکھتے ہی نہیں کہ ان کے وجود میں پہلے اصول کا کوئی دخل نہ ہو۔ اس کے بخلاف حقیقت یہ ہے کہ وہ اسی اصل کی شاخیں ہیں یا کم از کم یہ کہ اس کے راست تقاضوں میں شامل ہیں۔ اور انہیں اختیار کئے بغیر خود اس پر عمل کا حق بھی ادا نہیں ہو سکتا۔ اس طرح دوسرے اور تیسرے نکتوں پر عمل پیرا ہونا دراصل پہلے ہی نکتے کے اتباع کو مکمل کرنا ہے۔

اس دعوے کی صحت معلوم کرنے کے لئے اس کے علاوہ اور کسی بحث کی ضرورت نہیں کہ تقویٰ کے صحیح اور کامل عملی مفہوم کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے۔ جسے اوپر کی سطروں میں ابھی جلد ہی واضح بھی کیا جا چکا ہے یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ

کے نازل کئے ہوئے سارے احکام کی ٹھیک ٹھیک پیروی کا اور اس کی قائم کی ہوئی جملہ حدود کی پابندی کا نام تقویٰ ہے۔ اس بات کو اگر ذہن میں پوری طرح مستحضر کر لیا جائے تو یہ حقیقت آپ سے آپ روشن دکھائی دینے لگے گی کہ اقامت دین کے آخری دو اصول فی الواقع پہلے ہی اصول کے اجزاء یا اس کے قریب ترین تقاضے ہیں۔ اور یہ اس لئے کہ اپنے نصب العین کی خاطر تمام اہل ایمان کا متحد و منظم ہونا اور امر بالمعروف کو اپنی ایمانی زندگی کا شعار بنائے رکھنا بھی کتاب و سنت کی رو سے انہی احکام و حدود میں داخل ہے جن کی پیروی اور پابندی کا نام تقویٰ ہے۔ چنانچہ پہلے باہمی اتحاد کے بارے میں چند آیتوں کی شہادتیں سنئے :۔

(۱) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ (توبہ - ۱۱۹)

اے ایمان لانے والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور سچے مومنوں کے ساتھ رہو۔

(۲) إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ۔ (حجرات - ۱۰)

اہل ایمان تم آپس میں بھائی بھائی ہو سو اپنے دو بھائیوں کے درمیان (اختلاف و عناد پیدا ہو جانے کی صورت میں) صلح کرا دو۔ اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تاکہ اس کی رحمت سے سرفراز ہو سکو۔

(۳) وَاتَّقُوهُ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا ۖ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (روم - ۳۱، ۳۲)

اس کا تقویٰ اختیار کرو، نماز قائم کرو اور مشرکوں میں سے نہ بنو۔ یعنی ان لوگوں میں سے جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اور مختلف ٹولیوں میں بٹ کر رہ گئے اور اب ہر گروہ اپنے اپنے خیالات و افکار میں مگن ہے۔

ان آیتوں میں سے پہلی آیت کے اندر سچے مومنوں سے جڑ کر رہنے کو، اور دوسری کے اندر باہم پھٹے ہوئے مومن دلوں کے دوبارہ جوڑ دینے کو "اتقا" سے تعبیر کیا

گیا ہے اور تیسری آیت میں ایک طرف تو ملی انتشار کو شرک کا خلاصہ قرار دیا گیا ہے۔ گویا یہ کہا گیا ہے کہ ملی اتحاد توحید کا خاصہ ہے۔ دوسری طرف اس میں توحید کے ماننے والوں سے تقویٰ اور اقامت نماز کا مطالبہ کیا گیا ہے ان دونو چیزوں میں سے ایک (یعنی تقویٰ) تو توحید کا باطن ہے اور دوسرا (یعنی نماز) اس کا ظاہر ہے یہ سب باتیں اس امر پر صاف دلالت کرتی ہیں کہ ملی انتشار تقویٰ اور نماز دونوں کی روح کے یکسر منافی ہے جماعتی اتحاد اور تنظیم تقویٰ کی ضروری اور اہم ترین علامتوں میں سے ایک علامت ہے اور اس کا موجود نہ ہونا صحیح تقویٰ کے نہ ہونے کا ثبوت ہے۔

اس کے بعد کچھ دوسرے نصوص ملاحظہ ہوں جن میں سے اسی طرح امر بالمعروف کو بھی صلاح و تقویٰ کا کام قرار دیا گیا ہے :۔

(۱) يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ .... وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ (آل عمران - ۱۱۴' ۱۱۵)

یہ لوگ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں معروف کا حکم دیتے ہیں منکر سے روکتے ہیں اور اچھے کاموں میں تیز گام رہتے ہیں .... اور اللہ متقیوں سے واقف ہے۔

(۲) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُم مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً وَاعْلَمُوا أَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ (توبہ - ۱۲۳)

اے ایمان والو! ان کافروں سے لڑو جو تمہارے قریب میں ہیں اور چاہئے کہ وہ تمہارے اندر سختی پائیں۔ یاد رکھو اللہ متقیوں کے ساتھ ہے۔

پہلی آیت میں مطلقاً ہر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو متقیوں کی صفات اور تقویٰ کے اعمال میں شامل کیا گیا ہے اور دوسری میں نہی عن المنکر کی ایک خاص شکل، یعنی دین کے دشمنوں سے لڑنے کو تقویٰ سے موسوم کیا گیا ہے۔

اب ایک اور آیت سنئے، جو ان دونوں حقیقتوں کی جامع ہے :۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَ الْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (توبہ)

اور مومن مرد اور مومن عورتیں سب آپس میں ایک دوسرے کے "ولی" ہیں۔ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور بدی سے روکتے ہیں۔

اس آیت نے ملی اتحاد اور امر بالمعروف دونوں چیزوں کو ایمان کے اعمال اور مقتضیات کی حیثیت سے ایک ہی ساتھ جمع کر دیا ہے۔

ان تمام آیات کی روشنی میں اس وہم کی تاریکی کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ جب تک اقامت دین کے پہلے نکتہ پر پورا پورا عمل نہ ہو اور انسان کا باطن نور تقویٰ سے اچھی طرح جگمگا نہ جائے اس وقت تک اس کے لئے دوسرے اور تیسرے نکتوں کی طرف توجہ کرنا صحیح نہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ خیال آج ایک واقعہ بن کر ہمارے بے شمار ذہنوں پر مسلط ہے اور اس نے دین کی خدمت و نصرت کے بارے میں ہمارے فکر و عمل کے زاویے بدل کر رکھ دیئے ہیں۔ نصرت دین کی جو گاڑی تین پہیوں پر چلائی جانی چاہئے تھی اور جو ان تین پہیوں کے بغیر چل ہی نہیں سکتی۔ اسے صرف ایک پہیے سے چلانے کی عجیب و غریب کوشش ہو رہی ہے' جس کا نتیجہ قدرتی طور پر یہ نکل رہا ہے کہ یہ گاڑی ایک انچ بھی آگے بڑھنے کے بجائے اپنی جگہ کھڑی زمین میں کچھ اور دھنستی ہی جا رہی ہے۔ دراصل یہ خیال ایک زبردست حجاب ہے جو ہمارے اکثر نیکو کار افراد کی بصیرتوں پر خاص طور سے پڑا ہوا ہے اس کا ظاہری پہلو یقیناً" بڑا دیندار نہ دکھائی دیتا ہے مگر حقیقتاً" یہ نظریہ اسلامی طرز فکر سے قطعاً" لگاؤ نہیں رکھتا جب ایک شخص سچا متقی بن ہی اس وقت سکتا ہے جب وہ اہل ایمان گروہ سے مربوط بھی رہے اور اپنی سکت بھر امر بالمعروف کا فرض بھی انجام دیتا رہے۔ تو یہ کہنا کتنا بے معنی ہو گا کہ آدمی پہلے کامل اور معیاری متقی بن لے تب کہیں جا کر ملی اتحاد و تنظیم اور امر بالمعروف کی مہمات کا آغاز کرے۔ ان تینوں نکات کی مثال تو بالکل ایک درخت کے اجزاء کی سی ہے' جس طرح بیج سے جوں ہی ننھا سا

پودا اُگتا ہے اس میں جڑ' تنے اور پتے سب کی تخلیق ہو جاتی ہے اور یہ تینوں چیزیں ایک ساتھ نمو پاتی اور پروان چڑھتی رہتی ہیں۔ ایسا نہیں ہوتا کہ بیج سے جڑ نکل کر خوب موٹی تازی ہو لیتی ہے تب اس میں سے تنا نکلتا ہے اور جب تنا اپنی پوری بالیدگی کی حد کو پہنچ جاتا ہے تب جا کر اس میں سے پتیاں نکلنی شروع ہوتی ہیں ....

اسی طرح قلب انسانی میں جب ایمان کا بیج جگہ پکڑتا ہے تو ایسا نہیں ہوتا کہ اس سے صرف تقویٰ کی جڑ ہی نکلتی ہو اور نکل کر ایک مدت دراز تک خوب موٹی تازی اور مضبوط ہوتی رہتی ہو۔ تب کہیں جا کر اتحاد ملی اور امربالمعروف کا موقع آتا ہو بلکہ ہوتا یہ ہے کہ ساتھ ہی ساتھ اس سے ملی اتحاد اور امربالمعروف کی شاخیں اور پتیاں بھی نکلنے لگتی ہیں۔ پھر زمین کی زرخیزی اور بیج کی عمدگی کے مطابق تقوے کی جڑ جس قدر گہری اترتی جاتی ہے اسی قدر شاخیں اور پتیاں بھی بلند و بالا اور سرسبز و شاداب ہوتی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَ فَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ کا منظر سامنے آ جاتا ہے۔